# شیعیت کی تاریخ اور شیعی عقائد کی تفصیل (حصہ اول)

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمسؔ لکھنوی– کراچی، پاکستان

**تمہید**

مولوی عبدالحئی صاحب لکھنؤ کے علمائے اہلسنت میں صاحب ذوق ادیب کامل، طبیب اور وسیع النظر مورخ تھے۔ ان کا تذکرہ گل رعنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے اس تذکرہ میں، ان کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ہندوستان میں شیعیت کے عروج کا یہ سبب بتایا ہے کہ غفرانمآب دلدار علی صاحب نصیر آبادی عراق سے تحصیل علم کر کے لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے اور آصف الدولہ اور ان کے وزیر سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں کو جو مذہبی آدمی تھے آمادہ کر کے اپنی جمعہ و جماعت سنیوں سے الگ کر لی اور بجبر خاندان کے خاندان شیعہ بنا لیے۔

اس میں پہلا جزو ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ یعنی غفران مآبؒ کے قیام لکھنؤ کے بعد سے شیعہ جمعہ و جماعت شروع ہوئی اور خاندان کے خاندان شیعہ ہو گئے۔

لیکن اس کا سبب جبر نہ تھا۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو غیر مسلم اسلام کے بارے میں کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلام اپنی حقانیت سے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان میں شیعیت کے زوال وعروج کے اسباب بتائے جائیں اور شیعی عقائد کی بنیادوں کی استواری کی تفصیل بیان کی جائے جس سے اندازہ ہو کہ ہندوستان میں شیعیت کے عروج کا سبب خود اس کے اصول کی معقولیت ہے اور اس کو زندہ کرنے کے لئے غفران مآبؒ نے کون سی تحریک شروع کی تھی اور اس تحریک کو پھر سے زندہ کرنے کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ اور اس دن کی یاد تازہ کرنا قومی شیرازہ بندی کے لئے کتنا ضروری ہے۔ اس مناسبت سے یہ کتاب اسی دن (۱۳؍رجب) کو شائع کی جا رہی ہے جس دن غفران مآبؒ نے اس تحریک کو شروع کیا تھا۔

**شیعیت کی تاریخ اور شیعی عقائد کی تفصیل**

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد و رفت بہت پہلے سے تھی۔ مگر ان کا بسنا فتوحات کے ساتھ شروع ہوا۔ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے زمانہ سے آباد ہونے والے خاندان اب تک موجود ہیں۔ تسلط و اقتدار کے ساتھ آبادی بھی بڑھتی گئی۔ عرب، ایران، ترکستان اور افغانستان کے بے شمار خاندان آباد ہو گئے۔ ان میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی۔ حکومتیں اگرچہ سنی تھیں لیکن انھوں نے قابل اور لائق شیعوں اور ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر سرفراز کیا جس سے ان کی حکومت مضبوط ہو گئی۔ یہی ان کے پیش نظر تھا۔ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے نہیں بلکہ اپنی حکومت قائم کرنے آئے تھے۔ اس حیثیت سے ان کی حکومت غیر مذہبی تھی مگر اس لحاظ سے کہ ان کا بھی ایک مذہب تھا جس کا وہ دوسروں کو بجبر پابند نہیں بناتے تھے لیکن خود اس پر عامل تھے اور اس مذہب کے دو جزو ہیں۔

(۱) حقوق اللہ     (۲) حقوق الناس

حقوق اللہ یعنی عبادات، اس کے جاننے اور بتانے والے علماء تھے۔ اس وجہ سے عبادت کے تمام ارکان ان کے ذریعہ سے انجام پاتے تھے۔ اور حقوق الناس یعنی ان کا برتاؤ رعایا سے اس ذیل میں ان کے مذہب کے تمام قوانین دیوانی

وفوجداری آجاتے تھے جس کے جاننے اور نافذ کرنے والے بھی علماء تھے۔ اس طرح ان کے آئین حکومت کا بڑا حصہ ان کے مذہب کے موافق تھا اور ان کے علماء حکومت کے بڑے حصہ دار تھے جو مفتی، قاضی، صدر اور صدر الصدور کی حیثیت سے تمام ملک پر چھائے ہوئے تھے۔ ان میں بعض جگہ شیعہ قاضی بھی مقرر ہوجاتے تھے مگر وہ فیصلہ سنی فقہ کی رو سے کرتے تھے اور مفتی تو سوائے سنی عالم کے کوئی ہوتا ہی نہ تھا۔

دارالسلطنت میں نماز جمعہ سنی علماء کی امامت میں ہوتی تھی۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور سب نمازیں بھی جماعت کے ساتھ سنی طریقہ پر ہوتی تھیں۔ عیدین کی نماز میں بادشاہ اور امراء بڑے تزک واحتشام سے عیدگاہ جاتے تھے اور کوئی دوسری جماعت نہیں ہوتی تھی۔

صوبوں میں عمال وحکام جہاں نماز پڑھتے تھے وہیں شہر کی بڑی جماعت ہوتی تھی۔ دوسرے شہروں میں قاضی ومفتی اور چھوٹے حکام کی موجودگی شہر کی نماز کو سرکاری حیثیت دے دیتی تھی۔ اس طرح ایک شہر میں متعدد جماعتوں کے مواقع کم تھے۔

ابتداء میں جو شیعہ سپاہی یا رکن سلطنت کی حیثیت سے سنی سلاطین کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے انھیں اپنی جماعت الگ قائم کرنا اس لئے ممکن نہ ہوا کہ امامت کے لئے کوئی شخص نہ ملتا تھا۔ چونکہ شیعہ فقہ میں مسئلہ ہے کہ اسلامی شوکت بڑھانے کے لئے اہلسنت کے ساتھ ان کی جماعت میں فرادیٰ کی نیت سے شریک ہوکر اپنے طور پر نماز پڑھ سکتے ہیں، اس لئے اس میں زیادہ آسانی نظر آئی اور شیعہ اہلسنت کے ساتھ نماز جماعت میں شریک ہونے لگے۔ یہ ایک رسم قائم ہوگئی اور مذہبی رواسم عام مسلمانوں کے ساتھ انجام دینے لگے رفتہ رفتہ نماز، روزہ، نکاح، طلاق، دفن، کفن سب انھیں کے ہاتھوں سے ان کے طریقہ پر ہونے لگا۔ جن مقامات میں پڑھے لکھے شیعہ اور سنی ساتھ رہتے تھے وہاں شیعوں کے طریقہ کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مثلاً نماز میں شیعہ ہاتھ کھول کر جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ دفن، کفن شیعوں کے طریقہ پر ہوتا تھا۔ بعض ایسی جگہیں بھی تھیں کہ پڑھے لکھے شیعوں کی آبادی ہونے کے باوجود تمام رواسم عام مسلمانوں کے ہاتھ سے انجام پاتے تھے۔ اسی طرح محرم کے رواسم میں سب شریک تھے۔ ان حالات میں شیعوں کی انفرادی حیثیت کوئی نہ رہی اور وہ عام مسلمانوں میں گم ہوگئے باہر سے آئے ہوئے شیعہ تو شیعہ رہے مگر ان کی اولاد اپنے اعمال وعقائد سے بے خبر ہوتی اور عام مسلمانوں کے اعمال وعقائد اور رسم ورواج اختیار کرتی گئی۔ پیری مریدی عرس، قوالی، چادر، شیخ سدو کا بکرا، میراں جی کے گلگلے، سید احمد کبیر کی گائے، سید سالار کی بیرق، مدار صاحب کی کندوری، باباشکر گنج کا کونڈا، بڑے پیر کا فاتحہ ایسے رواسم عام طور پر شیعوں میں مروج ہوگئے اور ان کے متعلق ایسے خیالات وابستہ ہوگئے جن سے ان کا ترک ناممکن ہوگیا، مثلاً شیخ سدّو کی کڑھائی چڑھتی تھی اور گلگلے تلے جاتے تھے اسے لوگ اپنی مراد پوری ہونے کے لئے کھاتے اور ایک دفعہ کھانے کے بعد ہر سال اس کا کرنا ضروری تھا ورنہ مشہور تھا کہ اس کے ترک سے آنکھوں میں درد شروع ہوتا ہے اور جب تک کڑھائی نہ چڑھے شدت بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ آنکھیں باہر نکل آتی ہیں اور ادھر کڑھائی چڑھی اُدھر صحت ہوئی۔ اسی طرح کے خیالات ان میں سے ہر ایک رسم کے ساتھ وابستہ تھے۔ اس لئے انھیں توڑنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

بھنگ نوشی کا عام دستور تھا۔ ہر گھر میں ایک چبوترہ ہوتا تھا جس پر بھنگ گھونٹی جاتی تھی اور سب مل کے پیتے تھے۔ ہر شہر میں حقہ اور بھنگ کی سیکڑوں دوکانیں تھیں جن میں ہر وقت بھنگ گھونٹی ہوئی تیار ملتی تھی، حقہ کی دوکان پر حقہ بھرا موجود رہتا تھا، سڑکوں پر بھی لوگ حقہ اور بھنگ پلاتے پھرتے تھے۔

سفر کی دشواریوں اور رسل ورسائل کے فقدان نے عراق سے کوئی ربط پیدا نہیں ہونے دیا اور شیعہ مجتہدین کے فیوض سے محروم ہوکر اجتہاد وتقلید کے مفہوم سے بے خبر ہوگئے۔ پڑھے لکھے لوگوں نے اخباریت اختیار کرلی۔

ایران سے فقط شاعرانہ ربط قائم رہا۔ ان حالات میں شیعیت کا دھندلا سا مفہوم ذہنوں میں رہ گیا اور برابر شیعہ سنی ہوتے چلے جارہے تھے۔ اور سب سے بڑی اخلاقی کمزوری یہ پیدا ہوگئی کہ اکثر لوگ طمع جاہ میں، بعض مروت میں، بعض خوف بیجا میں مبتلا ہوکے اپنے مذہب کو چھپانے لگے۔ کسی اور کا کیا ذکر صاحب تاریخ العلماء جو خود بھی ایک عالم تھے لکھتے ہیں کہ قاضی نوراللہ شوستری زندگی بھر اپنے مذہب کو چھپاتے رہے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں بہت سے لوگوں کی اولاد کا ترک مذہب کردینا یقینی ہے۔ اس طرح ایک ایسا ماحول بن گیا تھا جس میں شیعیت سنیت میں جذب ہوتی رہی۔ خاندان کے خاندان سنی ہوگئے۔ آج جو سید سنّی نظر آتے ہیں یہ اسی دور کی پیداوار ہیں۔ جب ان کا شجرہ نسب دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اجداد فلاں زمانہ میں عراق یا ایران سے آئے تھے اور شیعہ تھے خود مولوی سید سلیمان ندوی بھی ایسے ہی سنیوں میں تھے۔

آخر زمانہ میں جب شیعوں کی خودمختار ریاستیں قائم ہوئیں تو ان میں بھی شیعیت کا وہی حال رہا جو ڈھرّا بندھ گیا تھا وہ چلتا رہا اس کو توڑ نا ممکن بھی نہ تھا کیونکہ شیعہ مجتہدین موجود نہ تھے وہی مفتی، وہی قاضی، وہی سنی فقہ، وہی سنی جمعہ و جماعت بدستور جاری رہی۔

اس زوال میں شیعیت حساس دلوں کو اپنی فریاد سے بلاتی رہتی اور وہ بے بسی کے عالم میں دل مسوس کے رہ جاتے تھے۔ قدرت نے یہ کارنامہ سادات جائس اور نصیرآباد کے علمی خاندان کی ایک فرد[1] سید دلدارعلی کے نام لکھ رکھا تھا جنھیں حساس دل، دقیق نظر، روشن دماغ، انقلابی ذہن، آہنی عزم اور پُرتاثیر زبان عطا کر کے تجدید مذہب، تعمیر قوم اور تنظیم ملت کی ذمہ داری سونپی اور ۱۱۶۶ھ جمعہ کی رات کو یہ آفتاب ہدایت افق نصیرآباد سے طالع ہوا۔

دیہات کی زندگی نے کھیتی باڑی کا مشغلہ بھی لازم کردیا تھا۔ وہ بچپنے سے نہایت متین، سنجیدہ اور غور وفکر کے عادی تھے۔ اس مشغلہ نے آبادی سے باہر کھیتوں کی منڈیروں کو ان کا مکتب فکر بنادیا جہاں وہ شیعیت کی اس گمنامی کو غور کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اور بار باران کے دل میں علم دین حاصل کر کے تبلیغ مذہب کا جوش پیدا ہوتا تھا۔ تاریخ وسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ اپنے کھیتوں کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے کہ یکا یک روشنی پیدا ہوئی اور آواز آئی کہ ''دلدارعلی جا اور علم دین حاصل کر۔'' حقیقت میں یہی تو ان کے ضمیر کی آواز تھی جسے

(۱) جس طرح خاندان بنی امیہ کی ایک فرد (عبدالرحمن) نے بنی عباس کے خوف سے بھاگ کر اسپین میں ایک شاندار حکومت قائم کر کے قیصر وکسریٰ کے شان وشکوہ کو گرد کردیا جس کی یادگاریں آسمان کی گردشیں آج تک نہ مٹا سکیں۔ اسی طرح خاندان رسالت کی ایک فرد (ابوطالب حمزہ) نے بنی عباس کی سخت گیریوں سے تنگ آ کے اپنے پردادا امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے مدفن کو چھوڑ کر ایران کا رُخ کیا۔ جہاں وہ دوسری ربیع الاول ۲۹۲ھ کو شیراز میں انتقال کرگئے۔ ان کے بیٹے (سید ابوالعلیٰ محمد) سبزوار میں جاکر مقیم ہوئے اور وہاں علوم اہلبیتؑ کی اشاعت اس طرح کی کہ وہ دارالایمان مشہور ہوگیا۔ ۲۸ رصفر ۳۰۳ھ کو انھوں نے وفات پائی مگر ان کی اولاد نے وہاں علمی وروحانی مرکزیت حاصل کرلی۔ سبکتگین کا نامور بیٹا محمود جس وقت ہندوستان پر حملے کررہا تھا اس زمانہ میں سید ابوالعلیٰ محمد کے پوتے سید نجم الدین اپنے متبعین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان آئے اور وڈیانگر کو فتح کر کے جائے عیش نام رکھا جو کثرت استعمال سے جائس ہوگیا۔ اس وقت سے یہ قصبہ سادات نقویہ کا مسکن ہوا۔ چند سالوں کے بعد ان کی اولاد نے قریب کی ایک ریاست پٹاک پور کو فتح کر کے نصیرآباد میں علمی وروحانی مسند بچھا کے بیٹھا جس کی روشنی دور دور پہنچی حکومت وقت نے بھی اس خاندان کے افراد کو اتالیقی، معلمی قضا اور صدارت کے عہدوں پر سرفراز کیا اور علمی حیثیت سے جائس کا بھی ایک درجہ سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ اس خاندان کی ایک فرد سید عبدالقادر کو اورنگ زیب نے ولی عہد کی معلمی پر مامور کیا تھا اور انھوں نے شہزادے کو شیعیت سے روشناس کیا یہاں تک کہ بہادر شاہ بننے کے بعد انھوں نے اپنے تشیع کا اعلان کردیا جس پر ہنگامہ برپا ہوا تفصیلات تاریخ میں موجود ہیں۔

وہ سوتے جاگتے برابر سنا کرتے تھے۔ آخر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور ہندوستان کے مشہور علماء سے فلسفہ، منطق، ہیئت وریاضی میں کمال حاصل کر کے لکھنؤ آئے۔ اس وقت آصف الدولہ حکمراں اور سرفراز الدولہ وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے وزیر اعظم کے یہاں رسائی حاصل کی اور ایک دن موقع پا کے اپنا سارا درد دل بیان کر دیا۔ حسن اتفاق کہ وہ بھی اس درد میں ان کے شریک نکلے اور کہا کہ آپ تبلیغ کیجئے میں سہولتیں پیدا کروں گا انھوں نے کہا کہ پہلے میں خود تو علم دین حاصل کروں اس کے بعد تبلیغ کا موقع ہے۔ چنانچہ طے پایا کہ نجف اشرف جا کر جتنے دنوں وہاں ضرورت ہو قیام کر کے علم دین حاصل کریں۔ نواب نے پانچ ہزار روپے اپنی جیب سے دیئے اور ہندوستان کا یہ فلسفی دین کا طالب علم بن کر باب مدینہ علم کی طرف روانہ ہوا۔ مشہور ہے کہ کئی ماہ میں بادبانی جہاز نے بصرہ کے قریب پہنچایا تھا کہ باد مخالف کے طوفان نے پندرہویں دن بمبئی کے ساحل پر لا کھڑا کیا۔ مگر دلیرانہ [1] ہمت اور جواں مردانہ عزم کف دہاں سمندر کو للکار کے پھر اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ اب کی سمندر مغلوب اور بیڑا پار تھا۔ نجف پہنچ کر کسی بچے نے نہیں ایک مفکر اور فلسفی نے وہاں کے اکابر علماء سے مذہب کے اصول کی گہرائیوں اور فروع کی بلندیوں کو سمجھا۔ اس میں پانچ برس کامل صرف کئے۔ اب ہندوستان واپس ہوئے اور وہ مقصد جس کی تکمیل کے لئے ان کی روح بے چین تھی بیس برس کامل مشقت کے بعد اس کو پورا کرنے کے لئے عمل کا میدان سامنے آیا اور ان کا وہ عملی کارنامہ شروع ہوا جس نے دنیائے اسلام میں ان کو مجدد اعظم تسلیم کرا لیا اور وہی ہمارا اصل موضوع ہے جسے ہم تفصیل سے بیان کریں گے۔ اس کے متعلق ہمیں دو باتیں بیان کرنا ہیں۔ ایک ان کا ذوق تبلیغ دوسرے علمی منزلت۔

**ذوق تبلیغ**

ذوق تبلیغ کے بارے میں آپ سن چکے ہیں کہ وہ ایک غیبی آواز سے بے چین ہو کے گھر سے نکلے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کے اکابر علماء سے علوم عقلیہ کی تکمیل کر کے عراق گئے۔ وہاں پانچ برس قیام کیا مگر کسی وقت وہ ذوق تبلیغ سے خالی نہ تھے۔ انھیں اس مقصد میں اپنی پوری زندگی کا صرف ہو جانا کافی نہ معلوم ہوتا تھا اور بار بار یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ میرے بعد کہیں یہ کام رک نہ جائے۔ اس لئے وہ بے چین ہو ہو کے دعائیں [2] مانگتے تھے کہ بارالہا میری اولاد میں تا قیامت علم دین باقی رہے۔ اس طرح انھوں نے تڑپ تڑپ کے اپنے دنوں کو رات اور راتوں کو دن کیا۔ اور جب وہ وقت آیا کہ ان کی دعا کی قبولیت کا اثر ظاہر ہوا اور ان کے بیٹے ان کے سامنے علم و فضل، درس و تدریس تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت مذہب میں ان کے برابر کے شریک ہو گئے تو انھوں نے اس پر اکتفا نہیں کی اور تین وصیت نامے لکھے جن میں سے ہر ایک میں عزاداری کی ترویج اور مذہب کی تبلیغ کی وصیت کی ہے۔

**علمی کارنامہ**

علمی کارنامہ کے بارے میں آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ

---

(۱) بعض تاریخوں میں ہے کہ وہ سندھ کے راستے سے کربلا گئے مگر یہ صحیح نہیں۔

(۲) علامہ کنتوری لکھتے ہیں کہ میرے ایک بزرگ رسول پور کے جناب غفران مآبؒ کے ہم سفر تھے۔ نجف میں شب قدر کے اعمال کئے اور ان کو بھی شریک کیا اور فرمایا کہ جب ایک عمود نور، قبہ مبارکہ سے آسمان تک نظر آئے تو وہی استجابتِ دعا کا وقت ہے تم دعا میں مصروف ہو جانا۔ چنانچہ جب وہ وقت آیا تو جناب غفران مآبؒ نے دعا کی ''خداوندا بحق صاحب قبر میری اولاد سے قیامت تک علم دین نہ جائے۔'' سید صاحب نے دعا کی ''خداوندا رسولؐ پور کی بارہ پٹی میں سوائے میرے اور کوئی میرا شریک نہ ہو۔'' جناب غفران مآبؒ نے ایک دو ہتھڑ ان کو مارا کہ اے کمبخت یہ کیا دعا مانگی۔ سید صاحب نے کہا تم زمینداری کا مزہ کیا جانو۔ مُلا آدمی لڑکے پڑھانے کا تو تم کو مزہ ہے۔ زمینداری کی جڑ پاتال میں ہوتی ہے جیسے دوب کی جڑ۔ تاریخ العلماء ص ۱۵۰

انھوں نے ہندوستان میں معقولات کی اور نجف میں علوم اہلبیتؑ کی تکمیل کی اور وہ درجہ حاصل کیا کہ متقدمین فلاسفہ کی صف اول میں شمار کئے گئے۔

علامہ عبدالحیٔ فرنگی محلی جو اپنے وقت کے مشہور فلسفی تھے ان کا یہ قول علامہ سید مرتضیٰ فلسفی نے معراج العقول میں لکھا ہے کہ جب میں جناب غفران مآبؒ کے حاشیہ صدرا کو دیکھتا ہوں تو بعض اکابر فلاسفہ پر ان کو ترجیح دیتا ہوں۔

### ذھنی صلاحیت

ذہنی صلاحیت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ وہ اپنے اساتذہ کی مجلس درس میں ترجمان کی حیثیت رکھتے تھے اور استاد کے اُلجھے ہوئے مطلب کو اس طرح سلجھا دیتے تھے کہ طالب علم کے ذہن میں اتر جاتا تھا اور چند دن میں وہ اپنے استاد پر بار ہو جاتے تھے۔فیض آباد کا واقعہ مشہور ہے کہ اقلیدس کا ایک مسئلہ شاگرد نہیں سمجھ رہے تھے اور استاد کی طرف سے بار بار کوشش جاری تھی آخر میں جناب غفران مآبؒ نے قلم کا ایک سرا زمین پر اور ایک دیوار پر رکھ کر مثلث بنایا اور مسئلہ سمجھا دیا یہ بات استاد کے دل میں کھٹک گئی اور وہ دشمن ہو گئے۔نواب حسن رضا خاں سے تقریب ملاقات بھی اسی طرح ہوئی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا نے ان کو وہ تقریری صلاحیت دی تھی جس سے وہ اپنی بات دل ودماغ میں اتار دیتے تھے۔

ان کے بیٹے سلطان العلماء کی مشہور کتاب بوارق موبقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فلسفہ کی تکمیل کے بعد ہندوستان کی سیاحت بھی کی اور مشہور فلاسفہ سے معرکہ آراء مباحثے بھی ہوئے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالعلی صاحب سے شاہجہانپور کی مسجد میں ملاقات ہوئی۔انھوں نے اپنی مشہور شرح سلّم میں جوملا حمداللہ پر اعتراضات کئے ہیں کا جواب جناب غفران مآبؒ نے دیا تو وہ کوئی شافی جواب نہ دے سکے۔

ملاحسن سے دہلی کی جامع مسجد میں ملاقات ہوئی اور مسئلہ انجرار وتر پر بحث ہوئی تو ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یہ علمی درجہ حاصل کرنے کے بعد وہ عراق گئے وہاں جس ذوق اور کاوش سے علم حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب کبھی گھر سے کوئی خط آیا تو اسے پڑھا نہیں کہ نہ معلوم کیا خبر ہو اور کتنی دیر تک دل ودماغ کو متاثر رکھ کے تحصیل علم سے مانع رہے۔ خط جمع کرتے رہے، چلتے وقت سب کو نکال کے پڑھا، اس کاوش سے علم حاصل کر کے اس ذوق تبلیغ کو ساتھ لے کے وہ ہندوستان پلٹے، وعدہ کے موافق نواب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی کتابیں مختلف مذاہب کی دو دفعہ منگوا کے دیں اور وہ سیاسی توڑ جوڑ سے اپنے کو علٰحدہ کر کے صرف ایک مقصد کو سامنے رکھ کے بیک وقت تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور تبلیغ میں مشغول ہو گئے جس میں سے ہر ایک کی تفصیل ایک کارنامہ ہے۔

### تصنیف وتالیف

تصنیف وتالیف کے میدان میں قدم رکھا تو سب سے پہلے ''عمادالاسلام'' کی پہلی جلد الٰہیات سے شروع کی جس میں حکمائے یونان، فلاسفۂ اسلام اور علمائے امت کے اقوال کے ردوابطال میں جو معرکے دکھلائے ہیں اس نے علمائے سابقین ولاحقین کے کارنامے محو کر دیئے۔

علامہ عبدالحسین صاحب استاد فلسفہ (جامعہ سلطانیہ لکھنؤ) اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''یہ ایک ایسی جامع اور حاوی کتاب ہے جس کی نظیر مذہب امامیہ کے کتب خانہ بلکہ اسلامی کتاب خانہ میں ناپید ہے۔اس کی تعریف کے لئے میدان قلم کوتاہ اور جولانیٔ دماغ ناکافی ہے۔اس میں ایسے مطالب عالیہ بیان کئے گئے ہیں جن کا سمجھنا خالی از اشکال نہیں، چہ جائے کہ ان کی توضیح وتقریر کرنا۔ مرحوم اَعْلَی اللّٰہُ دَرَجَتَہٗ نے یہ کتاب نہیں لکھی بلکہ درسگاہِ تحقیق اور بزمِ قدس منعقد کی ہے، جس میں تمام علماء، حکماء اور متکلمین اسلام کو مدعو کر لیا ہے۔اس میں اگر ایک طرف افلاطون الٰہی مع اپنی تحقیقات کے، ارسطو مع اپنی آراء کے جلوہ افروز ہیں۔تو دوسری طرف ابوالنصر فارابی، شیخ الرئیس ابوعلی بن سینا مع شفاء

واشارات کے زیب دہِ انجمن ہیں۔ ایک طرف اگر بہمن یار مع تجرید کے، میر باقر داماد مع اپنی تصنیفات کے زینت افزائے بزم ہیں، تو دوسری طرف علامہ حلیؒ مع ''نہایت المرام'' کے، قوشجی مع شرح تجرید کے، شیخ مفیدؒ مع مقالات کے، سید مرتضیٰ علیہ الرحمہ، مع شافی کے، سید علی بن طاؤسؒ مع طرائف کے، رونق افزائے محفل ہیں۔ وسط میں اشاعرہ اور معتزلہ کا گروہ مع اپنے تلامذہ اور اتباع کے جن میں حافظ نظام، ابوالہذیل علاف بلخی وغیرہ وغیرہ موجود ہیں۔ ایک گوشہ میں ملا صدرالدین شیرازیؒ مع اسفار اور شارح مواقف مع اپنی تصنیفات کے تشریف فرما ہیں، دوسرے گوشہ میں شہید ثالث قاضی نوراللہ شوستری اور علامہ فضل بن روز بہانؒ مع احقاق الحق اور ابطال الباطل کے حاضر ہیں۔

صدر نشین بزم قدس جناب غفران مآب علیہ الرحمہ ہیں، آپ کے ہاتھوں میں عنانِ کمیت قلم ہے اور وہ اس کو میدان تحقیق میں جولان کر رہے ہیں۔ آپ کی تحقیق اتنی کامل، آپ کی نظر اتنی وسیع ہے کہ آپ کے فیصلہ کو تمام علماء مانے ہوئے ہیں، آپ پر مجال نہیں کہ کوئی اعتراض کر سکے اور آپ کی تحقیق کو رد کر سکے۔

**عراق کے مشہور عالم شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحبِ 'جواہر الکلام' لکھتے ہیں:**

''مراۃ العقول (الملقب بعماد الاسلام) جس کے مصنف ہیں اسلام کے رکن اعظم اور خلق خدا پر خدا کی حجت، جنھوں نے عقول کو اپنی موشگافیوں سے حیران کر دیا اور عقلی شبہوں کو اپنی فکر ونظر کے ستاروں سے روشن کر دیا، جن کے انواع علوم کی حدیں معین کرنے سے اجناس وفصول قاصر ہیں اور جنھوں نے تحریر کی مشکل شکلوں کو اپنے بیان کے منطوق کے ذریعہ سے واضح کیا، تمام خلق خدا کے مرکز اور عقول عشرہ[1] کے مدمقابل گیارہویں عقل''
(ظل ممدود از مفتی میر عباس صاحب)

**ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:**

بلند مرتبہ علامہ، خدا کی بولتی ہوئی کتاب، جن کی ذات پر اجتہاد ختم ہوگیا۔۔۔۔۔۔ خدا کی سب سے بڑی آیت اولین وآخرین کے اندر۔ (ظل ممدود)

**علامہ شیخ احمد یمنی صاحب نفحۃ الیمن لکھتے ہیں:**

آپ کی مہارت علم اصول میں جعفری، آپ کا احاطہ فروع مسائل میں یوسفی، آپ کی درایت فہم حدیث میں باقری، آپ کی تحریر وتقریر حقائق کی پردہ در اور دقیق نکتوں کو واضح کرنے والی ہے۔ کون آپ کی ہمسری کر سکتا ہے؟ اگر علامہ حلّی ہوتے تو آپ کی اقتدا کرتے، اگر مجلسیؒ اور مفیدؒ آپ کے مفید مجالس درس میں، حاضر ہوتے تو بحارُ الانوار کو آپ کے دریائے علم کے پہلو میں حقیر سمجھتے۔ اللہ اکبر کس قدر علوم وفنون میں آپ کا حصہ بلند اور مقام رفیع ہے۔
(ظل ممدود مرتبہ جناب مفتی میر عباس صاحب)

**مولانا اعجاز حسین صاحب اور برادر مولانا میر حامد حسین صاحب مرحوم شذور العقیان فی تراجم الاعیان میں اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ**

انھوں نے تلمذ حاصل کیا خدا کی اس نشانی سے جو تمام عالموں کا رب ہے۔ وہ ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے مملکت ہندوستان میں دین کو زندہ کیا اور بدعت وجاہلیت کے آثار کو محو (باطل) کیا۔ یعنی علّامہ مولانا سید دلدار علی نصیر آبادیؒ۔
(منقول از حیات فردوس مکاں)

حقیقت میں خدا کو ان سے جو اہم کام لینا تھا اس کا تقاضا

---

(۱) فلاسفہ یونان قائل ہیں کہ اللہ کی مخلوق بلا واسطہ عقل اوّل ہے اور عقل اوّل نے عقل ثانی کو پیدا کیا اور عقلِ ثانی نے عقل ثالث کو، یوں ہی دس عقول تک سلسلہ پہنچا اور نو فلک پیدا ہوئے، پھر انھیں عقول وافلاک کی شرکت سے تمام کائنات وجود میں آئی۔

یہی تھا کہ ان کا علم، ان کا عزم، ان کی ہمت اور ان کی سیرت ائمہ اہلبیتؑ کا پرتو ہو۔ یہی اوصاف ان کے علمی کارنامے کی جان ہیں۔ اگر ان کا علم، ان کی بلند نظر، ان کی تعمق فکر فوق البشر نہ ہوتی تو ہندوستان کی شیعیت کی تاریخ کچھ اور ہوتی ان کی بلندیٔ نظر ہر خامی کو دیکھتی تھی خواہ وہ کہیں ہو۔ جس طرح انھوں نے ہندوستان کے اکابر علما سے مختبرانہ ملاقات کی اسی طرح وہ عراق جا کر وہاں کے علماء سے مرعوب نہیں ہوئے اور وہاں سے واپس آئے تو ان کی نقل نہیں اتاری۔ بلکہ ہندوستان میں ان طریقوں سے شیعیت کی ترویج کی جو یہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب تھے۔

**ہندوستان میں شیعوں کی پہلی نماز جماعت**

آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ شیعوں کی نماز جماعت ہندوستان میں کہیں نہیں ہوتی تھی اور ایک نئی بات کی ابتداء کرنے کی نہ کسی کو جرأت تھی اور نہ کوئی نماز پڑھانے والا میسّر تھا۔ پڑھے لکھے شیعہ عموماً اخباری تھے جن کے نزدیک جمعہ وجماعت درست نہیں۔ اس طرح شیعوں کی الگ کوئی اجتماعی زندگی نہ تھی اور بحیثیت شیعہ ایک قوم ہونے کا کوئی تصور کسی کے دماغ میں نہ تھا بلکہ عام طور پر لوگ اس کے اظہار سے کتراتے تھے جس کے نتائج کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

**شیعہ قومیت کی تشکیل**

اس وقت ضرورت اس کی تھی کہ شیعوں کے مذہبی عقائد انھیں بتائے جائیں ان کی نماز، ان کے مذہبی رواسم الگ قائم ہوں اور ان میں اتنی جرأت پیدا کی جائے کہ وہ بحیثیت شیعہ ایک اجتماعی زندگی اختیار کرکے ایک قوم بن جائیں۔ اس کے لئے جناب غفران مآبؒ نے جو صورتیں اختیار کیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے نواب حسن رضا خان کو آمادہ کیا کہ شیعوں کی نماز جماعت شروع ہو۔ لیکن نواب کو جرأت نہ ہوئی جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب اصرار بڑھا تو پھر بھی اس کا اعلان نہیں کیا گیا اور نہ کسی مسجد میں اعلان کرنے کی ہمت کی گئی۔ نواب کے گھر میں ملا محمد علی فیض آبادی اور شیخ اکبر علی چشتی مودودی نے غفران مآبؒ کی اقتدا میں چند مخصوصین کے ساتھ نماز پڑھی۔ یہ ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کی مبارک تاریخ تھی۔ قدسیؔ جائسی کا شعر ہے

شیعیانِ ہند کی پہلی جماعت کی نماز
جس سے عہدِ آصف الدولہ کو ہے خاص امتیاز

یہ مبارک تاریخ ہندوستان میں شیعہ قوم کی تشکیل کا نوروز ہے جس کی یاد کو تازہ رکھنا ہر فرد کا قومی فریضہ ہے۔

**نماز جمعہ کی ابتداء**

اس کے بعد انھوں نے بڑی جرأت سے کام لیا اور مذہب میں گویا نئی بات کی ابتدا کی یعنی ۲۷ رجب کو جمعہ کی نماز قائم کی جو عراق وایران میں بھی نہ ہوتی تھی، البتہ اب چند سال سے کہیں کہیں ہونے لگی ہے۔ اس کے وجوب پر ایک استدلالی کتاب لکھی۔ اس طرح انھوں نے عراق وایران کی بھی ایک کمی کو یہاں پورا کیا۔

**موعظہ کی ابتداء**

نماز کے بعد موعظہ شروع ہوا جس میں رفتہ رفتہ مجمع بڑھتا گیا۔ سرفراز الدولہ، آصف الدولہ کو بھی ایک دن کھینچ لائے مگر غفران مآبؒ سے کہہ دیا کہ نواب بھنگ کے عادی ہیں، اس کے متعلق کچھ نہ کہئے گا، لیکن اس دن کا موعظہ مسکرات ہی کی حرمت پر تھا نواب کا ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ رہ رہ کے اپنی لمبی لمبی موچھوں کو بل دیتے تھے۔ وزیر اعظم کی نظر نواب پر تھی۔ دل میں پنکھے لگے تھے کہ دیکھئے خدا آج کیا دکھاتا ہے۔ ابھی موعظہ تمام نہ ہوا تھا کہ نواب نے بلند آواز سے کہا کہ باوا جان کے سر کی قسم جو آج سے بھنگ کو منھ لگایا ہو، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں خدا نے وہ اثر دیا تھا کہ جو قلوب کو پھیر سکتا تھا اور سینہ میں وہ دل دیا تھا جو سوا خدا کے کسی اور سے نہ ڈرتا تھا۔

**اصلاحی کوششیں**

تحریر کے ذریعہ جو انھوں نے اصلاحی کوششیں کیں، وہ اگرچہ ہندوستان کی ضرورت کے مطابق تھیں مگر چونکہ وہ تقلیدی نہ

تھیں بلکہ خود ان کی قوتِ اجتہاد کا نتیجہ تھیں، اس لئے ان کی اہمیت اور افادیت ہندوستان تک محدود نہیں رہی۔

## تصوف کی مخالفت

ہندوستان میں تصوف کا بڑا زور تھا۔ علمائے عراق نے اس پر شیعی نقطۂ نظر کی وضاحت نہیں کی۔ علمائے ایران میں علامہ مجلسیؒ نے ایک ہلکی سی روشنی ڈالی۔ اس وجہ سے اکثر علمائے شیعہ کو اس بارے میں مسامحہ ہوتا رہا۔ علامہ محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی نے سماع (قوالی) کو جائز قرار دیا۔ شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستریؒ نے اکابر صوفیہ کی تعریف میں اتنی خامہ فرسائی کی کہ ان کی مذہبی حیثیت مشکوک ہوگئی اور صاحب تاریخ العلماء کو لکھنا پڑا کہ ان کو بدمذہب سمجھنا درست نہیں کیوں کہ انھوں نے صوفیہ کی تعریف کے ساتھ ان کے اقوال کی تاویل کی ہے اور اس کا کچھ اور مطلب بیان کیا ہے۔ بہرحال اس وقت تک کوئی واضح خط صوفیت اور شیعیت کے درمیان نہ تھا۔ جناب غفران مآبؒ نے ایک معرکہ آراء کتاب ''شہاب ثاقب'' صوفیت کی رد میں لکھ کر ان کے فلسفہ اور عمل وقول کی دھجیاں اُڑا دیں اور ایسا قلع قمع کیا کہ شیعوں سے اس کا استیصال ہوگیا۔

## اخباریت کی رد

ہندوستان کے شیعوں میں عام طور سے اخباریت پھیلی ہوئی تھی، وہ اجتہاد وتقلید کو ناجائز سمجھتے تھے۔ غفران مآبؒ نے اس موضوع پر ''اساس الاصول'' لکھ کے اخباریت کی جڑ اُکھاڑ دی۔ اب ہندوستان میں اخباری نہ ہونے کے برابر ہیں۔

علم کلام میں انھوں نے توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت پر مستقل کتابیں لکھیں اور بڑے شد ومد سے جبر وقدر، رویت باری، معصیت انبیاء اور خلافت غیر منصوص کی رد کر کے مذہب اہل بیت کو ثابت کیا۔ اس سے پہلے عقلی ونقلی حیثیت سے اتنی مدلل، اتنی مفصل، اتنی مکمل بحث کسی نے نہیں کی تھی۔ اس سے ہندوستان میں ایک ہلچل مچ گئی اور شیعہ سنی دونوں نے ان کے خلاف محاذ قائم کر دیا۔

چنانچہ اخباریوں کی طرف سے ''اساس الاصول'' کی رد لکھی گئی۔ تفضّل حسین خان علامہ نے عماد الاسلام پر اعتراضات کئے۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے تحفہ اثناعشریہ میں توحید سے لے کر معاد تک شیعہ نقطۂ نظر کی رد کی۔ اس طرح ایک میدانِ کارزار گرم ہوگیا۔ ایک ایک موضوع پر کتابوں کے انبار لگ گئے اور ایک ایسا ذخیرہ فراہم ہوگیا جو عراق وایران کو بھی آج تک نصیب نہیں ہوا۔

## تعزیہ داری

تعزیہ داری کا وجود ہندوستان میں بہت پہلے سے تھا۔ دکن کے عاشورخانے، سندھ کے امام بارگاہ، یو۔ پی۔ کے امام باڑے قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں ان میں علم، پنجے اور تعزیے رکھے جاتے تھے۔ مبکی نظمیں تنہا اور چند آدمی مل کے راگ سے پڑھتے تھے۔ موجودہ زمانہ کی سوزخوانی اور نوحہ خوانی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ اس سے بجز حصول ثواب اور کوئی افادیت نہ تھی، وہ بھی جب کہ حدود شرع میں ہو۔ جلوس بھی نکلتے تھے جن میں شہنائی، روشن چوکی، طبل، تاشہ، جھانجھ بجتے اور ماہی مراتب (مچھلی اور چوپاؤں کے سر چاندی اور پیتل کے بانسوں پر لگے ہوئے) کے ساتھ براق اور گنبد تعزیوں کی جگہ ہوتے تھے، کچھ کچھ دور پر ٹھہر ٹھہر کے بانک اور پٹے کا فن دکھاتے اور یا حسینؑ کی آواز بلند کرتے جاتے، ان رواسم کی بجا آوری میں سب مسلمان یکساں طور پر شریک تھے، البتہ عاشورخانے اور امامباڑے شیعہ ہی تعمیر کرتے تھے مگر اس میں مرثیہ کہنے اور پڑھنے میں کوئی تخصیص نہ تھی۔

غفران مآبؒ نے روشن چوکی اور شہنائی کو آلات غنا ہونے کی وجہ سے حرام اور طبل، تاشہ کو جنگی باجا ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا، جھنڈیوں، ماہی مراتب کے بدلے علم، گنبد کی جگہ تعزیئے اور براق کے بدلے ذوالجناح کو بانک اور پٹے کا فن دکھانے کے عوض نوحہ خوانی اور سینہ کوبی کو رواج دیا۔ حاضری، مہندی اور نذر ونیاز ایسے رواسم قائم کئے۔ محرم کے دس دن میں

ہر دن ایک شہید کے ذکر سے مخصوص کیا۔ مجلسوں میں عراق کی روضہ خوانی کے طرز پر ذاکری شروع کی جس میں اہلبیت ؑ کے فضائل میں حدیثیں بھی مصائب کے ساتھ بیان کی جانے لگیں۔ اس طرح مجلس کی افادیت بڑھ گئی اور اس میں تبلیغی پہلو پیدا ہوگیا اور ان رواسم کو اتنا عام کر دیا کہ گھر گھر مجلس اور گلی گلی تعزیئے اٹھنے لگے۔ اس طرح انھوں نے شیعوں کی تعزیہ داری کو ایک نئی شکل دے کر عام مسلمانوں سے علٰحدہ کر دیا اور اس سے مذہبی تبلیغ، قومی تنظیم اور شیعی تمدن کی تشکیل کی۔

اس سلسلہ میں ایک کمی جو عراق وایران میں ہے، انھوں نے یہاں اس کو پورا کیا۔ علمائے عراق وایران مجلسیں پڑھنا اپنی شان اور مرتبہ کے خلاف سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکری جیسے وہاں روضہ خوانی کہتے ہیں کم پڑھے لکھے لوگوں کا کام رہ گیا اور اس میں کوئی ترقی نہ ہوسکی۔ لیکن جناب غفران مآبؒ نے واقعات کربلا کے متعلق معتبر روایتوں کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کرکے ''اثارۃ الاحزان'' کے نام سے پیش کیا، عاشورہ کے دن عصر کے بعد خود مجلس پڑھنے کی ابتداء کی، سر و پا برہنہ گریبان کھلا آستین چڑھی ہوئی سراپا تصویر غم بنے ہوئے گھر سے اپنے امام باڑے میں آئے اور اسی شان سے منبر پر تشریف لے جاتے تھے۔ اس طرح ہندوستان کے علماء میں انھوں نے یہ سنت قائم کی کہ ان کے بعد ان کے جانشین یہ مجلس پڑھتے رہے۔ آج بھی یہ مجلس اسی وقت ان کے امام باڑے میں ہوتی ہے۔ اب یہاں کے علماء کو جو حقیقت میں انھیں کے ذرّیات تھے اس پر اعتراض اور اس سے احتراز کی کیا ہمت ہوسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت سے علماء مجلسیں پڑھنے لگے، یہاں تک کہ ان کی چوتھی پشت میں بحر العلوم جناب محمد حسین عرف علن صاحب پیدا ہوئے جنھوں نے ذاکری کے فن میں انقلاب پیدا کیا اور کلام مناظرہ، حدیث وتفسیر سے تقریر کو علمی بنا کر موجودہ طرز ذاکری کے موجد ہوئے۔ اس طرز کو سید جواد ہندی نے عراق میں جا کے پیش کیا اور اتنی مقبولیت حاصل کی کہ ہر شخص ان کا گرویدہ ہوگیا۔ آج تک ان کا نام عربوں کی زبان پر ہے۔ ۱۹۲۴ء میں جب میں عراق گیا تو ان کے صاحبزادے وہاں چوٹی کے ذاکروں میں تھے۔ عرب بڑے شوق سے ان کی مجلس میں شریک ہوتے تھے میں نے بھی ان کی مجلسیں سنیں، ہندوستان کے ذاکروں سے کوئی نسبت نہ تھی۔

**درس وتدریس**

ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مجلس درس قائم کی جس میں بقول حضرت سید العلماءؒ وہ ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتے تھے جو تنہا اپنے شاگردوں کو تمام علوم کی تعلیم دے کے جید عالم بنا دیتے تھے اور سب سے بڑا کارنامہ ان کا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سیرت وکردار اور تعلیم سے اپنے شاگردوں کو اتنا متاثر کیا اور ایسی اسپرٹ پیدا کردی کہ وہ کار تبلیغ میں ان کے شریک ہوگئے اور ہندوستان کے جس گوشہ میں جس کو بھیج دیا وہ خدا پر بھروسہ کرکے گھر بار چھوڑ کے روانہ ہوگیا۔ اس طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے مبلغین ہتھیلی پر سر رکھ کر پہنچ گئے۔ وہاں کے شیعوں کو عقائد کی تعلیم دی اور ان کے دلوں سے خوف وہراس دور کرکے اپنے اعمال کو عام مسلمانوں سے علیحدہ بجالانے کی جرأت پیدا کی۔ جمعہ وجماعت قائم کی۔ مسجد وامام باڑہ بنوایا، عزاداری کو رواج دیا، بدعتوں سے روکا، دفن، کفن، نکاح، طلاق سب شیعوں کے طریقہ پر ہونے لگا۔ اس طرح سارے ہندوستان میں بغیر کسی منصوبے اور سرمایہ کے انھوں نے تبلیغ کرکے پیغمبری کا کام انجام دیا۔ چونکہ ان کی تحریک کا تعلق صرف شیعوں سے تھا کسی اور کو وہ دعوت نہیں دیتے تھے اس وجہ سے دوسروں کو کچھ بولنے کی گنجائش نظر نہ آئی بعض جگہ ان مولویوں کو جو شیعوں کے یہاں نکاح طلاق، تجہیز وتکفین کی خدمت انجام دیتے تھے اور ہر ایک کے لئے ان کا ایک حق معین تھا اس کے لئے طے کیا کہ ہر موقع کے لئے جو حق ان کا معین ہے ان کو دیا جائے اور خدمت ہم سے لی جائے اس طرح یہ انتظام کیا کہ ان کا بھی مالی نقصان نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ صدیوں سے خوف دلوں میں بیٹھا تھا وہ دور ہوگیا اور سارے ہندوستان میں شیعیت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر جگہ شیعہ بحیثیت ایک

قوم کے نظر آنے لگے جن کے نام، مذہبی رواسم، اخلاق، طرز معاشرت، معیارفکر، زاویہ نظر، تعلیم اورلٹریچر سب الگ ہوکرایک مستقل قوم بن گئے اور ہندوستان کی قوموں میں اپنی علمی اورتمدنی حیثیت سے ایک ممتاز درجہ حاصل کرلیا۔

مذہبی معاملات میں ان کے نقطۂ نظر اور اندازِ فکر میں تبدیلی ہوگئی وہ رسولؐ کی تعلیم کوصحیح طور پر سمجھنے کے لئے انھیں افراد کے دامن سے وابستہ ہوگئے جن کا تعارف رسولؐ کی زندگی کا مستقل مشن تھااور وہ اوروں کی مذہبی اور روحانی سیادت وقیادت کے قائل نہ رہے جس کے نتیجہ میں شیخ سدّو، میران جی، سید احمد کبیر، سید سالار مدار صاحب، پیران پیر خودبخود ساقط ہوگئے۔ اور جب اہل بیتؑ رسول کے فضائل ومناقب بیان کئے جانے لگے اور عزاداری نے ایک انقلابی کروٹ بدلی اور دوسروں کی طرف سے اس پر بدعت کے فتوے لگنے لگے تو حاضری، نذر ونیاز اورعلم وتعزیہ کو بدعت کہنے والوں کو چارہ نہ رہا کہ وہ شیخ سدّو کے گلگلے، سید احمد کبیر کی گائے اور سید سالار کے جھنڈے کو بھی بند کرائیں۔اس طرح اہل سنت کوبھی فائدہ پہنچا چنانچہ غفران مآبؒ کی تحریک کی اتنی غیر معمولی کامیابی کوتائیدخدا سمجھا گیا۔ حجۃ الاسلام مولانا احمد علی صاحب محمد آبادی لکھتے ہیں کہ:

''چشم فلک نے ایسا مجدد مذہب نہیں دیکھا۔''

شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحب جواہر لکھتے ہیں:

''زندہ کرنے والے مذہبی رسوم کے، آباد کرنے والے اس کی منزلوں کے، وہ ماہتاب جس کا طلوع گمراہوں کی ہدایت، وہ شہسوار جن کے ہاتھ میں اسلام کا رایت، جن کی نگہداری میں اسلام کے ستون سربلند ہوئے۔''

مفتی میر عباس صاحب جناب غفران مآبؒ کے صاحبزادوں کومخاطب کر کے کہتے ہیں:

''اے رفعت وبلندی کے مالک، اے ورع وتقویٰ کی جائے پناہ، اے ہدایت کے نور، اے آفتاب روز! آپ کے سبب سے ہماری سرزمین پر شریعت حضرت محمد مصطفیؐ ظاہر ہوئی۔ اگر آپ نہ ہوتے، اے میرے سرداران ملّت، توہمیں خبر بھی نہ ہوتی کہ ہمارا دین ومذہب کیا ہے۔کیا کہنا آپ لوگوں کا کہ جو شخص آپ کی زیارت کرے وہ ہدایت پا جائے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے آپ کو کثیر علم کا مالک بنایا، ناک رگڑ دینے کو دشمنوں کی۔ میرا فخر ہے کہ میں ہدایت حاصل کرنے والا ہوں، اس یگانۂ عصر، امام سے'' (رطب العرب ص۔۸۲)

علامہ کنتوری لکھتے ہیں:

بلاتشبیہ ہمارے اس ہادیٔ دین نے ہندوستان میں وہی کام کیا جو مدینہ میں ان کے جدنامدار نے۔۔۔۔۔اس خاندان ہدایت کے دشمن بدخواہ ہمیشہ روسیاہ رہیں گے۔۔۔۔۔۔ تمہارے گھروں میں جو چبوترے بھنگ نوشی کے تھے، ان پر سجّادے بچھوادیئے، تمہاری نذرونیاز میں جو شیخ سدّو کا بکرا، شیخ فرید کی شیرینی، باباشکر گنج کا کونڈا، شاہ مدار کی کندوری، سید سالار کی بیرق جاری تھی، اب عمل گوسفند اور حضرت عباسؑ کی حاضری اورعلم وتعزیئے بنام شہدائے کربلا جاری کرائے۔

مولانا محمد حسین صاحب قبلہ تاریخ العلماء میں لکھتے ہیں:

آپ کا فضل وکمال، علوئے مرتبت واجلال بیان سے باہر ہے۔ فقط یہی کافی ہے کہ ہندوستان میں دین اسلام آپ ہی کے وجود سے پایا جاتا ہے۔۔۔۔اہل علم پر کیا جہلاء پر بھی آپ کا احسان ہے۔ جیسے حضرت علیؑ کی تلوار آبدار نے سرکشان عرب کو زیر کردیا اور لات، عزّیٰ اورمنات تینوں کو طاقہائے حرم سے منھ کے بل گرادیا، ایسے ہی ہندوستان میں اگرچہ برائے نام تشیع تھا مگر کہیں نشۂ بھنگ نوشی، کہیں احمد کبیر کی گائے۔ کہیں۔۔۔۔۔ یہاں بھی دلدار علی کے سیفِ قلم نے ہندوستان کو جو کفرستان تھا دارالایمان بنادیا۔ یہ آپ کے خلوص کا اثر ہے جو جابجا اس زمانہ پرآشوب میں پھر کر، دشمنوں میں رہ کر، عرب وعجم کا سفر دور دراز کر کے، علوم دینیہ حاصل کر کے تحت قبہ ابی عبداللہ الحسینؑ جو دعا مانگی تھی کہ میری اولاد میں تاقیامت علم دین باقی رہے سو بحمداللہ اب تک ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گا اور آپ کا خاندان، خاندانِ

اجتہاد کے نام سے قائم ہو گیا۔ (تاریخ العلماء ص ۱۴۷)

مولانا اعجاز حسین صاحب برادر مولانا حامد حسین صاحب لکھتے ہیں:

انھوں نے ہندوستان کے شہروں میں دین کو زندہ کیا اور بدعت وجاہلیت کے آثار کو محو و باطل کر دیا۔

اس سے بڑھ کر ان کی خوش قسمتی اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سامنے ہندوستان بھر میں شیعیت سر اٹھا کے کھڑی ہو گئی اور لکھنؤ اس کا مرکز بن گیا جس کے در و دیوار پر شیعیت چھا گئی اور اس طرف عام میلان ہو گیا۔ ہندو تک تعزیہ داری کرنے لگے اور کثرت سے علماء، فضلاء، اطباء، شعراء اور بافہم افراد شیعہ ہو گئے۔ مرزا جعفر علی فصیح مثنوی نان و نمک میں فرماتے ہیں:

حامیٔ دیں، ماحیٔ کفر وضلال
سرگروہِ عالمان باکمال
علم سے جس کے عمل توام ہوا
دین جس کے زور سے محکم ہوا
لکھنؤ اب سبز وار[۱] ہند ہے
دم بدم افزوں بہار ہند ہے

لیکن وہ حالت پیدا نہ ہونے پائی جو سنّی حکومتوں میں شیعوں کی تھی۔ خاص لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل کا ہندوستان میں سب سے بڑا علمی خاندان اور سب سے بڑی درس گاہ (مدرسۂ نظامیہ) اور کثرت سے علماء موجود تھے، جمعہ و جماعت و موعظہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔ حکومت میں ان کا اتنا اثر تھا کہ اس زمانہ میں بھی اس کے مفتی قضا اور افتاء کی مسند پر وہی متمکن تھے۔

غفران مآبؒ نے حکومت سے اپنے کو علاحدہ رکھا۔ ان کا خیال تھا کہ نائبِ امام کا حکومت کے سامنے جھکنا اور اس کی دربار داری کرنا منصب نیابت کی توہین اور ان مشاغل میں کمی واقع ہونے کا سبب ہے جو اس عہدہ کے فرائض میں داخل ہیں۔ ان کی اس علاحدگی اور بے نیازی کی وجہ سے آصف الدولہ کو ان سے اور ان کی تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ معمولی معمولی آدمی خطابات سے سرفراز ہوئے۔ مگر غفران مآبؒ زندگی بھر مولوی صاحب کہے گئے۔ شعراء کے وظائف معین ہوئے، صوفیوں اور ولیوں پر عنایتیں ہوئیں۔ گورکھپور شکار کھیلنے گئے وہاں محرم کا چاند نکل آیا۔ ایک صوفی کو (جو میاں صاحب مشہور تھے) تعزیہ رکھے ہوئے دیکھا، ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر دے آئے، جواب تک موجود ہے، مگر غفران مآبؒ ان کے شہر میں تعزیہ داری اور اس کی تبلیغ کرتے رہے اور آصف الدولہ وہیں بیٹھے لکھ لٹاتے رہے لیکن غفران مآبؒ پر ان کی چشم کرم[۲] کبھی نہ پڑی۔ البتہ آصف الدولہ کو ان کے علمی و روحانی فیوض و برکات کے ............ کے

---

(۱) سبزوار سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ان کے بزرگوں نے سبزوار کو دارالایمان بنایا اسی طرح انھوں نے لکھنؤ کو دارالایمان بنایا۔

(۲) اگرچہ سرفراز الدولہ کے ذریعہ سے وہ بادشاہ سے جو چاہتے کرا سکتے تھے مگر غفران مآبؒ نے کبھی ان موقعوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ چنانچہ ایک دفعہ آصف الدولہ نے کئی لاکھ روپیہ امور خیر میں صرف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سرفراز الدولہ نے غفران مآبؒ کو وہ رقم دلوانا چاہی اور آصف الدولہ سے کہا کہ مولوی دلدار علی صاحب سے مشورہ کیا جائے۔ آصف الدولہ نے بلا کے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اس رقم سے کربلا و نجف کے درمیان ایک نہر کھدوا دیجئے وہاں کے لوگوں کو پانی کی بہت تکلیف ہے چنانچہ اس روپیہ سے نہر آصفی کھدوائی گئی۔

ایک دفعہ آصف الدولہ نے کہا میرا ولی عہد سید زادہ ہے اس کی شادی کسی سید زادی سے کرنا چاہتا ہوں۔ سرفراز الدولہ جھٹ بول اٹھے کہ مولوی صاحب کی صاحبزادی سے بہتر کون سید زادی ملے گی یہ سن کے آصف الدولہ اچھل پڑے اور کہا واجان کے سر کی قسم بے مثل تجویز ہے، تم ہی پیام لے کے جاؤ اور اسی وقت تاریخ معین ہو گئی۔ سرفراز الدولہ دربار سے پلٹتے ہی غفران مآبؒ کے پاس آئے اور خوشی خوشی ماجرا بیان کیا انھیں امید تھی کہ غفران مآبؒ بھی خوش ہو جائیں گے اور واقعی دوسرا ہوتا تو اسے تخت شاہی زیر قدم نظر آنے لگتا مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب غفران مآبؒ نے ناگواری کا اظہار کیا اور کہا کہ اہل دنیا سے ہمارا پیوند مناسب نہیں نواب نے کہا اب تو میں کہہ چکا اور وہ بہت پسند کر چکے غفران مآبؒ نے ان سے ایک سانڈنی سوار لے کے اسی وقت نصیر آباد بھیجا اور اپنے ایک قریبی عزیز کے لڑکے کو بلوا کے دوسرے دن نکاح کر دیا۔ جب وہاں سے پیام آیا تو کہہ دیا کہ لڑکی کا عقد ہو چکا۔ اس سے آصف الدولہ بہت کبیدہ ہوئے۔

بڑھنے سے خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کی طرح اپنی حکومت کے لئے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا اور ان پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی، بلکہ خود بھی تعزیہ داری وغیرہ بڑے انہاک سے کرتے رہے۔ اتنا موقع میسر آتے ہی ایک حقیقی نائبِ امام نے دنیا کے سامنے ائمہ اہلبیتؑ کی سیرت، علمی و روحانی منزلت اور صحیح اسلامی تعلیمات کا اپنے اور اپنے گھر والوں (۱) کو ایک ایسا نمونہ بنا کے پیش کیا کہ سر نہیں دل جھک گئے اور ایک تازہ انقلاب پیدا ہو گیا۔ دنیا نے مان لیا کہ وہ اپنے علمی تبحر اور سیرت و کردار کی بلندی سے آفتاب ہدایت بن کے طالع ہوئے اور اپنی علمی موشگافیوں سے عقول کو حیران کر دیا۔ دین خدا میں گروہ در گروہ لوگ داخل ہوئے جس میں جبر کا کوئی دخل نہ تھا، بلکہ آپ سن چکے ہیں کہ حکومت کے معاملات میں علمائے فرنگی محلی دخیل تھے یہاں تک کہ آصف الدولہ کا زمانہ ختم ہوا اور نواب سعادت علی کا دور ہوا۔ اس وقت بھی حکومت کے حاشیہ پر علمائے فرنگی محل ہی نظر آتے ہیں اور غفران مآبؒ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

ہاں اس زمانہ میں نواب آصف الدولہ بہادر کی والدہ (بہو بیگم صاحبہ) نے غفران مآبؒ کو تقریباً ایک ہزار روپیہ ماہوار کی جائیداد معافی میں دی اب ان کے قوائے مضمحل ہو چکے تھے مگر ان کے پانچ بیٹے علم و فضل کی سند پر ان کے سامنے متمکن اور اسی طرح درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور مبلغین کے بھیجنے میں مشغول تھے۔ ان میں سب سے بڑے بیٹے محمد (سید محمد سلطان العلماء رضوان مآبؒ) اور سب سے چھوٹے بیٹے حسین (سید حسین سید العلماء علیین مکانؒ) نے باپ کی طرح علمی و روحانی مرجعیت حاصل کی۔

محمد جو تاریخ میں سید محمد سلطان العلماء بڑے قبلہ و کعبہ اور رضوان مآب کے خطابات والقاب کے ساتھ مشہور ہیں۔ ۱۱۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ صاحب تاریخ العلماء نے لکھا ہے کہ بظاہر انھوں نے غفران مآبؒ سے تعلیم پائی لیکن باطنی تلمذ حضرت صاحب الامر سے تھا۔ غفران مآبؒ کو حضرت نے بشارت دی تھی کہ تمہارا یہ بچہ میری تعلیم و حضانت میں ہے۔ چنانچہ سلطان العلماء بھی فخر فرماتے: اَنَا اَفْتَخِرُ بِصَاحِبِ الزَّمَانِي وَالْحُجَّةُ الْمُنْتَظَرِ الرَّبَّانِي قَدْ تَكَفَّلَ حِضَانَتِيْ وَرَبَّانِي۔

مفتی میر عباس صاحب اوراق الذہب میں لکھتے ہیں کہ یہ حکمت الٰہیہ جاننے والوں کے مقتدا اور مجتہدین کے نقطۂ آخر میں، ان کی نشو و نما کے ساتھ دین نے نشو و نما پائی اور ان کی سربلندی کے ساتھ ساتھ دین الٰہی سربلند ہوا۔ خدا نے ان کے چہرہ میں حسن کلام میں نمک الفاظ میں فصاحت عطا کی ہے۔ ان کی صحبتیں بہشت میں جہاں لغو اور غیر مشروع باتوں کا گذر نہیں۔ ان کی عادت میں حسن اخلاق و مزاج ہے۔ تلخ کلامی کرنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن جب مقدمات کے فیصلہ کے لئے اجلاس فرماتے ہیں تو کوئی شخص دم نہیں مار سکتا۔ ان میں سختی اور نرمی دونوں جوہر خدا نے ودیعت کئے ان میں تن تنہا قیام و قعود میں وہ ہیبت ہے جو بادشاہوں کو فوج و لشکر کے ساتھ بھی میسر نہیں۔ وہ جناب باوجود قوت قلب کے رحم دل اور بندوں پر مہربان ہیں۔ شجاعت میں شیر ان کے سامنے سے فرار کرتا ہے۔ موعظہ کے وقت پتھر اگر احساس کرے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ بالخصوص جب وہ جناب منبر پر موت اور قبر کا تذکرہ کرتے اور ابر بارندہ کی طرح روتے ہیں۔ خدا کے راستہ میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرتے صرف خدا کی رضا کے طالب رہتے ہیں۔

رطب العرب میں لکھتے ہیں کہ ان کے مرتبہ کی بلندی ان کی تحریروں اور عمدہ تصنیفوں سے ظاہر ہے۔ انھوں نے شریعت رسولؐ کی مدد کی اور ان کی وجہ سے ان کی تجدید ہوئی۔

مولانا حامد حسین صاحب مصنف عبقات رسالہ تقیہ میں لکھتے ہیں:

''علمائے متکلمین میں سب سے افضل، فقہاء و مجتہدین میں سب سے اکمل ہمارے اور تمام مومنین کے مولا و آقا، زمانہ

(۱) ان کے پانچ بیٹے محمد، علی، حسن، مہدی اور حسین تھے۔

میں یکتا اور وقت کے فرد خدا کی تائید ان کے ساتھ ہے۔ عراق کے علماء بھی ان کی علمی اور روحانی عظمت کے معترف ہیں۔"

حجۃ الاسلام علی نقی طباطبائی لکھتے ہیں:

"دائرۂ عقل کے مرکز، آسمان علم کے قطب، ارباب فضل کے راس ورئیس اپنے زمانہ میں یکتا اور وحید۔"

حجۃ الاسلام سید ابراہیم حائری صاحب ضوابط لکھتے ہیں:

"فلک اسلام کے قطب دائرہ عزت واحترام کے نقطہ، بدر تمام، احکام شرعیہ کا مدار ان کی ذات پر ہے اور مسائل حکمیہ کو انھوں نے زندہ کر دیا اور علم وکمال میں روح پھونک دی۔ شریعت کی بنیادوں کو قائم کیا۔ اور ہدایت کے راستوں میں چراغ روشن کر دیئے۔

شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحب جواہر لکھتے ہیں:

ایسے علامہ جن کا نظیر نہیں۔ معقول اور منقول، فروع واصول، جن کی ذات میں جمع ہیں۔ فقہا ومجتہدین کے فخر اسلام کے مددگار، عراق وایران وہندوستان کے مومنین کے آقائے اعظم نے ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔

(ظل ممدود مرتبہ مفتی میر عباس صاحب)

دوسرے بیٹے علی جو سید علی کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔

صاحب نجوم السما لکھتے ہیں:

عابد، زاہد، اتقیٰ، اکثر علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

مولانا اعجاز حسین صاحب شذور العقیان میں لکھتے ہیں:

"اَلْاِمَامُ الْھُمَامُ سَیِّدُ السَّنَدُ مَوْلَانَا سَیِّد عَلِی کَانَ عَالِمًا فَاضِلًا خَبِیْرًا بِالْمَعَانِی وَالْبَیَانِ وَاقِفًا عَلٰی الْفُرُوعِ وَالتَّفْسِیرِ وَالْقُرآنِ۔" اردو میں سب سے پہلے تفسیر قرآن آپ نے لکھی۔ ذوق عبادت کی وجہ سے ہجرت کر کے عراق چلے گئے۔ صاحب تاریخ العلماء لکھتے ہیں کہ علمائے عراق آپ کی بے حد تعظیم کرتے تھے ۱۲۵۹ھ میں وہیں انتقال کیا۔

تیسرے بیٹے سن ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد اور بھائی سے تحصیل علم کی، بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ صاحب تاریخ العلماء لکھتے ہیں:

"اکثر قائم اللیل وصائم النہار رہتے تھے۔"

مفتی میر عباس صاحب لکھتے ہیں:

"مُتَوَرِّعًا مُتَوَاضِعًا مَضرُوفًا اِلٰی الْعِبَادَۃِ۔ نہایت قوی تھے مگر کثرت عبادت سے قویٰ ضعیف ہو گئے تھے۔

تذکرۃ العلماء کے مصنف نے ایک خواب لکھا ہے کہ کسی شخص نے یہ خیال کیا کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا زیادہ ثواب ہے یا ان کے چھوٹے بھائی حسینؒ کے پیچھے۔ اسی رات کو خواب میں ایک بزرگ کو بار بار فرماتے سنا۔ اَلْحَسَنُ فِی الْجِنَانِ وَالْحُسَیْنُ فِی الْجِنَانِ ۱۲۵۹ھ میں انتقال کیا۔

چوتھے بیٹے مہدی ۱۲۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ صاحب نجوم السماء لکھتے ہیں:

"باوجود حداثت سن کے جودت طبع اور علم وتقویٰ اور ذکاوت میں کوئی برابری نہیں کر سکتا۔ آپ کی تحقیقات اور حواشی سے آپ کے فضائل معلوم ہو سکتے ہیں۔ راتیں بیداری میں بسر کرتے، تحقیق مسائل میں ایسا اجتہاد فرماتے تھے کہ ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تنہائی پسند، لذات وشہوات سے دور رہتے اور موت کو ہر وقت یاد کرتے رہتے تھے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ یہ علم وفضل، یہ تحقیق واجتہاد، یہ تصنیف وتالیف یہ زہد وورع سب کچھ ۲۳ برس کے سن کے اندر کی داستان جو اسی سال ختم ہو گئی۔ پانچویں بیٹے حسین جو سید العلماء سید حسین میرن صاحب، چھوٹے قبلہ وکعبہ علیین مکانؒ کے القاب وخطاب سے مشہور ہیں ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ولادت سے پہلے غفرانمآبؒ نے خواب میں امام حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ فرماتے ہیں تم اپنے بیٹوں کا نام رکھنے میں مجھے بھول گئے۔ انھوں نے عرض کی مولا میں ضعیف ہو گیا ہوں، اولاد کی امید نہیں، اس لئے میں نے آپ کے آخری فرزند کے نام پر اپنے آخری کا نام رکھ کے اس سلسلہ کو پورا کر دیا۔ فرمایا نہیں! اب کی تمہارے یہاں لڑکا ہوگا

اس کا نام حسین رکھنا۔ ان کے علم وفضل، زہد وورع کے متعلق مفتی میر عباس صاحب نے ایک پوری کتاب اوراق الذہب کے نام سے لکھی ہے۔ جس کا ترجمہ ہم شائع کریں گے۔ ان کے علمی اور روحانی کمالات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے تاریخ العلماء کی ایک عبارت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں: ''ایک بزرگوار زائر ائمہ اظہار فرماتے تھے کہ آپ کو اور علماء سے وہی نسبت ہے جو بشر کو فرشتہ سے۔ زائرین کا قول ہے کہ اگر کوئی بلاد وامصار کی سیر کرے اور علماء کی صحبت میں رہے تو آپ کی قدر معلوم ہو۔ اگر (۱) آپ عہد رسول میں ہوتے تو آپ کے فضائل میں کوئی آیت ضرور اُترتی اور ابوذر وسلمان پر آپ کو فضیلت دیتے۔ آپ کے تمام افعال وعادات طاعت وعبادت تھے۔ بعض فضلائے اہلسنت جب شیعہ ہوگئے اور آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر آپ کے حالات دیکھے تو حیران ہوکر کہتے تھے کہ آپ طاعت وعبادت میں مثل علی (۲) بن ابی طالبؑ کے ہیں۔ مفتی میر عباس صاحب اور مولوی حامد حسین صاحب وغیرہ سب انھیں کے شاگرد تھے۔ اپنی بلند پایہ تصنیفات کے علاوہ حضرت مسلم وہانی کے روضہ کی تعمیر، مسجد کوفہ کے مینار وغیرہ آپ ہی کی سعی کی یادگار ہیں ۱۲۷۳ھ کو انتقال کیا۔

سعادت علی خاں کا دور ختم ہوا اور غازی الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اس زمانے میں بھی حکومت کے مقنن علمائے فرنگی محل تھے اگرچہ شیعیت کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ سے لے کے وزراء اور امراء کی بنا کردہ کربلائیں اور امام باڑے شہر میں کثرت سے تھے جن میں ہندوؤں کے امام باڑے بھی تھے۔ گھر گھر مجلسیں ہوتیں اور گلی گلی تعزیئے نظر آتے۔ غفران مآبؒ اوران کے صاحبزادوں کے شاگرد، سیکڑوں جید علماء موجود تھے جن میں ہر ایک تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں مشغول تھا۔ اوران کے چھوٹے بڑے ہزاروں شاگرد موجود تھے۔ مگر غفران مآبؒ نے اپنی سیرت وکردار سے ان میں وہ علمی خودداری پیدا کردی تھی کہ ان میں سے کسی نے حکومت اور ارکان حکومت کی طرف توجہ نہیں کی۔ لکھنؤ کے کسی عالم کے متعلق یہ نہیں معلوم کہ وہ کس رئیس کی سرکار سے وابستہ رہا ہو۔ چونکہ بادشاہ مذہباً شیعہ تھے مسجد وامام باڑہ کی تعمیر اور عزاداری میں انہماک باعث نجات سمجھتے تھے اور ان امور کی انجام دہی میں علماء کے محتاج تھے۔ شاہانہ مزاج کا تقاضا تھا کہ ان کی مسجد میں وہی نماز پڑھائے جو سب سے بڑا عالم ہو، اس لئے وہ مجبور تھے کہ اپنی مسجد میں جمعہ وعیدین کی نماز اور دوسرے مذہبی امور میں غفران مآبؒ اور ان کے صاحبزادوں کی طرف رجوع کریں اوران لوگوں نے بھی اسی حدتک اپنا تعلق حکومت سے قائم رکھا۔ مسجد میں بادشاہ کے آگے

---

(۱) یہ جناب مفتی میر عباس کی عبارت کا بالکل ترجمہ ہے۔ وہ اوراق الذہب میں لکھتے ہیں لَوْ کَانَ فِی زَمَنِ جَدِّہٖ سَیِّدِ الْاِنْسِ وَ الْجَانِّ لَاَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْ مَدْحِہٖ شَیْئاً مِنَ الْقُرآنِ وَفَضَّلَہٗ جَدُّہٗ عَلٰی اَبِی ذَرٍ وَسَلْمَانَ۔

(۲) صاحب تاریخ العلماء خودبھی عالم تھے اس لئے کیا کہوں ورنہ مثل کی لفظ مجھے اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ اگرچہ مفتی میر عباس صاحب بھی اسی کے قریب قریب مثنوی من وسلویٰ میں ان دونوں حضرات کے متعلق لکھ گئے ہیں۔

| | |
|---|---|
| ایں ریاضت بر علی ختم است وبس | پرتو آں نیست الا در وکس |
| سالکانِ راہ تسلیم ورضا | وارثان مصطفی ومرتضا |
| نیّرین آسمان اجتہاد | آیتینِ قدرت رب عباد |
| سیدین عاملین کاملین | طاعت شاں برخلائق فرض عین |
| آں یکے ہم نام ختم الانبیاؐ | ویں سمی خامس آل عباعلیہ السلام |
| ہوش از سر برد طاعت ہائے شاں | سر نہادم بر نشاں پائے نشاں |

اور مسجد سے نکل کے بادشاہ کے پیچھے نہیں ہوئے اور اپنے منصب کے وقار کا ہر موقع پر لحاظ رکھا۔ اس زمانہ میں غفران مآبؒ کا انتقال ہوگیا۔ اور تمام ذمہ داریاں سلطان العلماءؒ کے سر آ پڑیں۔ سوء اتفاق سے ایسے بادشاہوں کا دور پایا جن کی کج دماغی مشہور ہے ان سے اپنے کو علٰیحدہ رکھنا ممکن نہ ہوا۔ انھوں نے اپنی مرضی پر چلانا اور اپنے ناجائز مقاصد کے حصول میں ان کی شرکت چاہی اور سلطان العلماء نے صاف انکار کر دیا۔ اب حکومت سے مستقل مخالفت شروع ہوگئی۔ اس میں سختیاں جھیلیں جان کی بازی لگائی مگر ثابت قدم رہے۔ تمام کتب سیر و تاریخ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ غازی الدین حیدر نے اپنے بیٹے نصیر الدین حیدر کو تخت و تاج سے محروم کرنا چاہا اور ایک محضر پر دستخط کرائے جس میں ان کی ابنیت سے انکار تھا۔ تمام علمائے اسلام، ارکان سلطنت اور روسائے شہر نے دستخط کر دیئے۔ مگر سلطان العلماء نے لکھ دیا اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ اس میں نصیر الدین حیدر کی عملی نااہلی کا تو اظہار تھا مگر ابنیت کی تصدیق تھی اور ضمناً بادشاہ کے عملی انکار ابنیت کو غیر صالح بھی قرار دینے کا اشارہ تھا۔ اس پر بادشاہ بہت برہم ہوئے اور زندگی بھر کبیدہ رہے۔

غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سلطان العلماء کی بڑی آؤ بھگت کی ولی عہدی کے زمانے سے اپنی طرف مائل سمجھ کے مگر تخت پر بیٹھتے ہی ان سے ٹکر ہوگئی ایک عورت سے (جسے اس کا شوہر چھوڑ چکا تھا مگر شرعی طور پر طلاق نہیں ہوا تھا) نکاح پڑھنے کے لئے طلب کیا۔ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ شوہر اول سے افتراق شرعی طور پر ثابت نہیں، اس لئے میں نکاح نہیں پڑھوں گا۔ بادشاہ کا چہرہ غصہ سے متغیر ہوگیا اور آپ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہہ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اس کے بعد شراب کے جواز کا فتویٰ اس صورت سے چاہا کہ طبیب حاذق نے بادشاہ کی زندگی کا انحصار شراب پینے میں تجویز کیا ہے، اس صورت میں حکم شرع کیا ہے؟ تمام علمائے اسلام نے جواز کا فتویٰ دیا۔ سلطان العلماء جانتے تھے کہ اس بہانے سے شراب نوشی مقصود ہے جس طرح جان بوجھ کے طبیب حاذق کی غلط تجویز ہے۔ اسی طرح مفتی کا فتویٰ غلط ہوگا۔ حقیقت تو یہی تھی مگر صورت مسئلہ میں طبیب حاذق کی رائے سے مخالفت مفتی کے لئے بے معنی ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لیا اور لکھ دیا لَا شِفَاءَ فِي الْحَرَامِ۔ ان سے پہلے کسی نے اس محل پر اس حدیث کو پیش نہیں کیا تھا۔ نصیر الدین حیدر کی تندمزاجی مشہور ہے۔ یہ دوسری جھڑپ تھی۔ اب رعب شاہی سے کام لینا چاہا اور ایک مسئلہ پوچھنے کے بہانے سے سلطان العلماء کو بلوایا۔ ایک کرسی پر خود بیٹھے اور ایک کرسی سامنے رکھوا کے اس پر قلمدان رکھ دیا اور ارادہ کیا کہ جب سلطان العلماء آئیں گے تو تعظیم نہ کروں گا۔ سلطان العلماء نے دروازے کے پاس پہنچتے ہی عربی قاعدے[1] کے موافق بلند آواز سے یا اللہ کہا اور اندر داخل ہوگئے۔ بے اختیار بادشاہ تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے اور وہ قلمدان اٹھا کے بیٹھ گئے۔ بادشاہ دیر تک سناٹے میں رہے۔ آخر میں یوں ہی ایک مسئلہ پوچھ کے رخصت کر دیا۔ جب مصاحبین خاص نے پوچھا، تو کہا جب وہ کمرے میں آئے معلوم ہوا کسی نے بغلوں میں ہاتھ دے کر کھڑا کر دیا۔ مفتی میر عباس صاحب نے اوراق الذہب میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے چہرے میں تنہا وہ رعب وجلال تھا جو بادشاہوں کو لشکروں کے ساتھ نصیب نہ تھا۔ اس واقعہ سے سلطان العلماء سمجھ گئے کہ بادشاہ کو مخالفت پیدا ہوگئی ہے اور وہ توہین پر آمادہ ہیں دوسری دفعہ جب بلائے گئے تو جانے سے انکار کر دیا۔ نصیر الدین حیدر اس کی تاب کہاں لا سکتے تھے، آگ بگولا ہوگئے۔ حکم دیا کہ مکان توپ سے اُڑا دیا جائے شہر میں ہل چل مچ گئی۔ رات کو یہ حکم ہوا تھا کہ بجلی کی طرح سارے شہر میں خبر دوڑ گئی۔ امرائے دربار دوڑے آئے کہ سلطان العلماء معافی مانگ لیں۔ انھوں

(۱) عرب میں دستور ہے کہ کسی کے مکان میں داخل ہونے کی اجازت کے لئے یا اللہ کہتے ہیں۔

نے صاف انکار کردیا۔ رات لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح ہوئی شاہی فوج کے کپتان نواب مقبول الدولہ نے توپ خانے سے دوتوپیں نکلوائیں۔ ایک سلطان العلماء کے مکان پر چڑھ گئی۔ دوسری محل سرائے شاہی پر۔ صبح کو بادشاہ کی آنکھ کھلی، معلوم ہوا شاہی محل پر توپ چڑھ گئی، حواس جاتے رہے۔ پوچھا یہ توپ کیوں اور کس نے چڑھائی ہے؟ معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے کپتان نے۔ وہ کہتے ہیں میری غیرت قبول نہیں کرتی کہ بادشاہ دین کا مکان توپ سے اُڑادوں اور بادشاہ دنیا کا محل کھڑا رہے۔ اس لئے میں اپنی دین ودنیا دونوں آج ختم کئے دیتا ہوں۔ احساس مذہبی نے بادشاہ کو چونکا دیا، اور شرمندہ ہوکر اپنا حکم منسوخ کیا۔ کپتان کو ان کے جوش ایمانی پر گراں بہا خلعت عنایت کیا، مگر سلطان العلماء سے زندگی بھر صفائی نہ رہی۔ اگر چہ مذہبی امور کی انجام دہی انھیں کے ہاتھوں ہوتی رہی۔ (تاریخ العلماء)

نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ انھوں نے جامع مسجد بنوائی اور سلطان العلماء سے نماز پڑھانے کی استدعا کی۔ انھوں نے کہا اس میں کچھ زمین نعیم خان کی شامل ہوگئی ہے، اس لئے میں نماز نہیں پڑھاؤں گا۔ یہ بادشاہ نہایت متدین اور بیدار مغز تھے، انھوں نے سلطان العلماء ہی کے سپرد اس کی تحقیقات کی اور کہا کہ شرعی حیثیت سے جواز کی صورت آپ نکال دیں۔ انھوں نے نعیم خان کو بلوا کے زمین کے معاوضے پر راضی کرلیا اور بادشاہ سے معاوضہ دلوا کے نماز پڑھائی۔

اس وقت شیعیت کا یہ عالم تھا کہ غفران مآبؒ کے چار بیٹے اور تیرہ پوتے یعنی سترہ آدمی ایک گھر میں علم وفضل کی مسند پر بیٹھے تھے۔ ان تیرہ پوتوں میں آٹھ مجتہد اور علامہ تھے۔ گھر کیا ایک یونیورسٹی تھا جہاں اپنے وقت کے کامل ترین اساتذہ محنتی طلباء کو درس دینے اور تصنیف وتالیف میں مشغول تھے۔ (۱)

(۱) سلطان العلماء کے نو بیٹے اور سب عالم۔ ان میں چار بڑے پایہ کے مجتہد تھے سب سے بڑے بیٹے محمد باقر علوم عقلیہ ونقلیہ میں بحر ناپیدا کنار تشیید مبانی الایمان علم کلام میں اور ردمنتہی الکلام مناظرہ میں ان کی معرکہ آرا کتابیں ہیں۔ سخاوت وعزاداری میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ہر مذہب کے تعزیہ خانوں میں جا کے چاندی سونے کے پھول چڑھاتے تھے جس سے غربا کثرت سے تعزیہ داری کرنے لگے۔ مہدی گنج میں روضۂ امام حسینؑ کی نقل اور ایک مسجد وکنواں بھی ان کی یادگار ہے۔

دوسرے بیٹے خلاصۃ العلماء سید مرتضیٰ جنھوں نے بہتوں کو مجتہد بنایا۔ تاج العلماء نے ثانی علم الہدیٰ لکھا ہے۔ سلطان العلماء کو بھی ان پر ناز تھا۔ تاریخ العلماء کے مصنف کا بیان ہے کہ اتنے ذہین تھے کہ بچپنے میں کتاب کے مطلب پر جو ایراد کرتے تھے وہ وارد ہوتا تھا۔ شرح لمعہ پر اس زمانے کا حاشیہ ان کی ایک معرکہ آرا تصنیف ہے۔ فنون سپہ گری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ زہد وورع اور سخاوت ضرب المثل تھی۔ مولانا حامد حسین مصنف عبقات وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ مرنے کے بعد تین دن تک قبر سے تلاوت قرآن کی آواز آتی رہی۔ تیسرے بیٹے بندہ حسین صاحب فلسفہ ومنطق میں اپنے وقت کے ارسطو سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے مشہور فلسفی انھیں کے شاگرد ہیں۔ زہد واتقا کا یہ عالم تھا کہ لوگ نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ قبلہ وکعبہ، سلطان العلماء اور سید العلماء کے لئے مخصوص تھا۔ یہ پہلے مجتہد ہیں جنھیں لوگوں نے جناب کہنا شروع کیا اور ان لوگوں کی زندگی تک کوئی دوسرا عالم قبلہ وکعبہ یا جناب نہیں کہا گیا۔ ان کے بعد یہ الفاظ اور کوئی خطاب بہت دن تک خاندان اجتہاد کے مجتہدین کے ساتھ مخصوص رہا مگر کچھ عرصہ کے بعد یہ خصوصیت باقی نہیں رہی۔ چوتھے بیٹے تاج العلماء علی محمد مجتہد اعلم عبرانی اور سریانی زبانوں میں بھی اتنی دستگاہ رکھتے تھے کہ سورۂ یوسف کی ضخیم تفسیر میں صفحے کے صفحے عبرانی کے درج ہیں۔ غفران مآبؒ کے چوتھے بیٹے سید مہدی صاحب کے بیٹے سید محمد ہادی صاحب ایک زبردست مجتہد تھے۔ مولانا اعجاز حسین صاحب نے شذور العقیان میں فقیہ محقق اور بہت کچھ لکھا ہے۔ زہد وورع کا یہ عالم تھا کہ راستہ میں فنس بند کر دیتے تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف اور جید علماء کے استاد تھے۔ غفران مآبؒ کے پانچویں بیٹے سید العلماء سید حسین کے چار بیٹے چاروں عالم ان میں دو بیٹے ممتاز العلماء سید تقی صاحب اور زبدۃ العلماء سید نقی صاحب زبردست مجتہد تھے۔

مفتی میر عباس صاحب نے اوراق الذہب میں سید تقی صاحب کی علمی جلالت کا بہت گرانقدر لفظوں میں اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سن میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر علم وفضل میں ہم سب سے مقدم ہیں۔ صاحب تاریخ العلماء نے باقر العلوم جناب سید باقر صاحب کے والد (جناب ابو صاحب کا جو خود بھی بڑے پایہ کے مجتہد تھے) قول لکھا ہے کہ وہ فقہ واصول میں علمائے عراق سے کم نہ تھے۔ علامہ کنتوری وغیرہ سب انھیں کے شاگرد تھے۔ فقہ واصول میں تصنیفیں بہ کثرت ہیں۔ ایک تفسیر بھی لکھی ہے جو معرکہ آرا سمجھی جاتی ہے۔

دوسرے جناب سید نقی صاحب جن کی مدح وثنا مفتی میر عباس صاحب نے اوراق الذہب میں اور صاحب تاریخ العلماء اور تذکرۃ العلماء نے بہت کی ہے۔ طول کے خوف سے ہم ترک کرتے ہیں۔

کثرت سے افاضل اور علماء ان لوگوں کی مجلس درس میں حاضر ہوتے تھے اور چند دن میں شیعہ ہو جاتے تھے جس میں جبر یا طمع کا دخل نہ تھا بلکہ اس علم وعمل کا نتیجہ تھا جس کا ذکر صاحب تاریخ العلماء نے کیا ہے کہ اکثر افاضل اہلسنت آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر شیعہ ہو گئے اور کہتے تھے کہ (بلا شبہ) زہد وورع میں علی بن ابی طالبؑ ایسے ہی ہوں گے۔

محمد علی شاہ کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ سریر سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ ایک متقی و پرہیزگار شخص تھے۔ مجتہد العصر سے اتنی عقیدت تھی کہ نام نہ لیتے تھے قبلہ وکعبہ کہتے تھے اور حکم تھا کہ کوئی نام نہ لے خود گھر پر ملنے آتے تھے اور یہ خطاب [1] دیا تھا۔

''مجمع علوم دین، مرجع سادات ومومنین، حافظ احکام الٰہ، مورد اعتقادات امجد علی شاہ سلطان العلماء مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب'' (ورثۃ الانبیاء)

بقول مولانا عبدالحلیم شرؔر ان کی خواہش تھی کہ مجتہد العصر جس طرح اٹھائیں اس طرح اٹھیں اور جس طرح بٹھائیں اس طرح بیٹھیں۔

انھوں نے سلطان العلماء سے حکومت میں اصلاح کی خواہش کی۔ سلطان العلماء نے اس شرط پر محکمۂ شرعیہ کے قیام کی تجویز پیش کی کہ اس پر حکومت کی بالا دستی نہ ہو کیونکہ شرع حکومت کے ماتحت نہیں ہو سکتی۔ بادشاہ نے یہ بہ خوشی منظور کیا اور محکمۂ شرعیہ قائم ہوا۔ مالیہ فوج کمپنی سے معاملت بادشاہ کے تحت میں رہی اور عدلیہ پولیس آبکاری اور تعلیم امور خیر حکومت سے کٹ کے محکمۂ شرعیہ میں آ گئے جیسے مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ اب حکومت کا مقنن خاندان اجتہاد ہوا۔ آبکاری اور دیوانی سلطان العلماء کے بڑے صاحبزادے مولانا سید محمد باقر صاحب کے سپرد ہوئی اور صفوۃ العلماء منصف الدولہ شریف الملک خطاب ہوا۔ انھوں نے تمام ممالک محروسہ میں مسکرات کے استعمال کو جرم قرار دیا۔ شراب کی ایک دوکان محکمۂ شرعیہ سے قائم ہوئی کہ جس کے لئے طبیب حاذق بطور انحصار دوا تجویز کرے اور سرٹیفکٹ دکھائے اسے اتنی ہی مقدار میں دی جائے۔ اس پر مشیرؔ مرحوم نے شعر کہا تھا

شراب جو نہ پئے آج کل وہ ناری [2] ہے
جناب قبلہ وکعبہ کو آبکاری [3] ہے

بدکاری جرم قرار پائی ایسی عورتوں کو نکاح کرنے کی تاکید ہوئی۔

فوجداری وپولیس سلطان العلماء کے دوسرے صاحبزادے مولانا السید مرتضٰی صاحب کے سپرد ہوئی اور خلاصۃ العلماء خطاب ہوا۔

مفتیوں اور قاضیوں کا تقرر اور ان کی دیکھ بھال سلطان العلماء کے بھتیجے سید ہادی صاحب کے سپرد ہوئی۔ اور عمدۃ العلماء خطاب ملا۔ اب تمام مملکت میں شیعہ مفتی وقاضی مقرر ہوئے۔ مفتی محمد قلی صاحب، مفتی میر عباس صاحب، مفتی دلدار حسین صاحب وغیرہ مختلف مقامات پر مفتی بنا کے بھیجے گئے۔ لیکن اہلسنت کے مذہبی معاملات کے تصفیہ کے لئے سنی مفتی اور اہل ہنود کے لئے ہندو مفتی بھی محکمہ شرعیہ نے مقرر کئے۔ چنانچہ ایک پرانے کاغذ میں ہم نے مفتی دیا شنکر کا نام بھی دیکھا تھا۔

تعلیم سلطان العلماء کے دوسرے بھتیجے سید تقی صاحب کے سپرد ہوئی اور ممتاز العلماء فخر المدرسین خطاب ملا۔ مولانا حامد حسین صاحب مصنف عبقات اور مولانا احمد علی صاحب مجتہد (محمد آبادی) وغیرہ ان کی ماتحتی میں مدرسی کے فرائض انجام دینے کے لئے مقرر ہوئے۔

خزانہ پر زکوٰۃ عائد ہوئی اس کی تقسیم سلطان العلماء کے

---

(۱) مجتہد کے لئے قبلہ وکعبہ کا استعمال پہلے پہل امجد علی شاہ نے شروع کیا۔

(۲) اس شعر پر بادشاہ نے مشیرؔ کی زبان کھینچ لینے کا حکم دیا۔ قبلہ وکعبہ نے یہ کہہ کے منسوخ کرایا کہ یہ مشیرؔ کی ہجوگوئی کا نتیجہ قرار دیا جائے گا۔

(۳) قدیم محاورہ ہے فلاں کو کوتوالی ہے، یعنی ان کے سپرد کوتوالی ہے۔

دوسرے بھتیجے سید نقی صاحب کے سپرد ہوئی اور زبدۃ العلماء معین المومنین خطاب ملا۔

ان تمام محکموں کے نگرانِ اعلیٰ سلطان العلماء تھے اور اہم مقدمات کا فیصلہ، قتل اور پھانسی انھیں کے حکم سے ہوتی تھی۔ ان کی عدالت کے حدود سے بادشاہ بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ لوگوں نے وزراء پر، بادشاہ پر، ولی عہد پر اس عدالت میں مقدمات دائر کئے اور کامیابی حاصل کی صاحب تاریخ العلماء لکھتے ہیں کہ امجد علی شاہ نے کسی تاجر سے تیرہ لاکھ روپیہ کا مسند، تکیہ خریدا تھا۔ عمال نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ روک لیا۔ وہ کچھ دنوں دوڑتا پھرا جب مایوس ہوا تو سلطان العلماء کے اجلاس پر بادشاہ پر مقدمہ دائر کر دیا سلطان العلماء نے ثبوت لے کے اس کی ڈگری دے دی اور حکم ہوا کہ بادشاہ فوراً روپیہ ادا کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے روپیہ ادا کر دیا اس سے سلطان العلماء کے انصاف کی دھوم مچ گئی۔

ولی عہد واجد علی شاہ پر ایک زنِ بازاری نے دعویٰ دائر کیا کہ وہ میری حضانت سے ایک لڑکی کو زبردستی لے گئے۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور فریقین کے ثبوت و بیان کے بعد فیصلہ ہوا کہ اس کی رقیت شرعی نہج سے ثابت ہوئی لہٰذا ولی عہد بہادر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً اس لڑکی کو مدعیہ کے سپرد کریں اور مدعیہ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ اس کا نکاح مرد صالح سے کردے۔ واجد علی شاہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اسی طرح کا ایک واقعہ یہ بھی تاریخوں میں موجود ہے کہ واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں کسی عورت کو اپنے تاہل میں لانا چاہا جو اُن پر حرام تھی۔ فتویٰ پوچھا۔ جواب نفی میں ملا۔ جب بادشاہ ہوئے تو خیال ہوا کہ شاید اب مرعوب ہو جائیں کہلوایا کہ کیا اس حکم پر نظر ثانی کی گنجائش ہے؟ سلطان العلماء نے جواب دیا حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ وَحَرَامُ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ (سلطان العلماء کا اصلی نام محمد تھا)

سلطان العلماء کے ایک فیصلہ کی اپیل کسی نے بادشاہ کے یہاں کی تو اس پر حکم صادر ہوا کہ ''فیصلۂ مجتہد ناطق است واپیل ندارد بدون امام''

راجہ درگا پرشاد بوستان اودھ میں لکھتے ہیں کہ سلطان العلماء کا حکم آب و باد پر جاری تھا۔ اس اقتدار کو دیکھ کر کسی نے ایک درخواست میں خطابی الفاظ ''مجمع علوم دین۔۔۔۔۔۔سلطان العلماء مجتہد العصر کے ساتھ صاحب بہادر لکھ دیا یہ دیکھ کر مسکرائے اور درخواست پر حکم صادر کرنے کے بعد لکھا سید محمد بے بہادر۔

اس وقت حقیقت میں ایک شیعہ عالم دین کی حکومت تھی مگر حضرات اہلسنت کو مذہبی امور میں اتنی آزادی تھی کہ جمعہ و جماعت اور درس وتدریس کا کیا ذکر، مناظرہ اور مباحثہ میں شیعوں کے خلاف دل کھول کے جو چاہتے تھے کہتے تھے۔ خود سلطان العلماء کی تصنیفات میں جواب میں کتابیں لکھی گئیں جن میں ان کو نہایت سخت و درشت الفاظ لکھے گئے۔ لیکن باوجود اس کے کہ وہ خود اس کے جواب میں قید کر سکتے تھے۔ زبان کھینچ سکتے، گردن مار سکتے تھے۔ گھر بار ضبط کر سکتے تھے مگر ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ انھوں نے کسی پر اس کے مذہب کی تبلیغ وحمایت میں سختی کی ہو۔ اور تحریر وتقریر کا جواب کسی اور طرح دیا ہو۔ بلکہ جس نوعیت کا اعتراض ہوتا تھا، اسی نوعیت کا ان کی طرف سے جواب ہوتا تھا۔

ان کے تحریری مباحثے کتابی صورت میں کتب خانوں کی زینت اور زبانی گفتگوئیں تاریخوں میں موجود ہیں، اس پر جبر کا شکوہ کہاں تک دیانت اور صدق پر مبنی ہو سکتا ہے۔

امجد علی شاہ کا دور ختم ہوا اور فرشتہ خصلت باپ کا فرشتہ سیرت بیٹا واجد علی شاہ مسند شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ تقویٰ اور پرہیزگاری میں باپ کے قدم بہ قدم تھے۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے لکھا ہے کہ میں مٹیا برج کے واجد علی شاہ کو تو جانتا ہوں وہ نہایت متقی و پرہیزگار تہجد گزار پابند شریعت مجسمۂ اخلاق تھے۔ ولی عہدی اور بادشاہی کے واجد علی شاہ کے متعلق سرورؔ نے ترجمہ شیرخانی میں لکھا ہے:

''بادشاہ شب زندہ دار اس کم سنی میں مشغول روزہ ونماز ہے۔''

اگر یہ صحیح ہے کہ ان سلاطین نے لوگوں کو بہ جبر شیعہ بنالیا تو نہایت تعجب ہے کہ غیر متعلق شہری عوام پر جبر کیا گیا اور خاص نمک خوار و خانہ زاد سنیت پر باقی رہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحلیم شررؔ کے نانا منشی قمرالدین خان زندگی بھر بادشاہ کے میر منشی رہے۔ ان ہی کے ساتھ مولانا عبدالحلیم شررؔ کا بچپنا اور جوانی گذری۔ اس لئے انھوں نے بادشاہ کے حالات چشم دید لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ باوجود اپنے مذہب کے سخت پابند ہونے کے وہ سنی شیعہ ہندو سب کو برابر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ میری ایک آنکھ سُنی ہے، ایک شیعہ۔ اور ہر زمانے میں ایک کثیر تعداد اہلسنت کی حکومت سے متعلق رہی۔ اسے بھی جانے دیجئے۔

واجد علی شاہ کے زمانہ میں انتزاع سلطنت ہوگیا مگر شیعہ ہونے کا سلسلہ اب تک جاری ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ شیعیت کا عروج کسی جبر یا طمع کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے اصول کی معقولیت کا تھا۔ چنانچہ غیر معروف لوگوں کا ذکر نہیں صاحب اقتدار اور ذی علم لوگوں میں، جن کو ہم نے دیکھا ہے، نواب رام پور، شمس العلماء نواب امداد امام اثرؔ (مصنف مصباح الظلم)، سر علی امام، مسٹر حسن امام بارایٹ لا، خان بہادر نواب احمد حسین خان صاحب رئیس پریانواں (مصنف تاریخ احمدی)، علماء میں مولانا مقبول احمد دہلوی، مولانا عبدالغفور بنارسی۔ ابھی حال میں مولانا محمد اسمٰعیل دیوبندی، مولانا سیف اللہ امام جمعہ شیعہ ہوگئے۔ اور اس سلسلہ میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کی کوئی وجہ ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ مبالغہ کی آمیزش سے بالکل ہی خالی ہے کہ جناب غفران مآبؒ کے ہندوستان میں تشریف لانے کے بعد سے اودھ کی شاہی کے اختتام تک اور اس وقت سے اس وقت تک بعض گنے چنے علماء کے علاوہ تمام علماء تمام واعظین کل مبلغین کا سلسلہ تلمذ قلیل یا کثیر واسطوں سے جناب غفران مآبؒ اور ان کی اولاد اطیاب ہی تک منتہی ہوتا ہے انھیں علماء و واعظین کی کوششوں سے آج بھی ہدایت کے چراغ روشن اور علم و عمل کی راہیں کشادہ ہیں۔ اس خانوادۂ محترم کی خصوصیت ہے کہ زمانے کی نبض شناسی کرتے ہوئے جس انداز میں تبلیغ و ہدایت کو مضمر دیکھا وہی انداز اختیار کر کے شیعیت کو چار چاند لگا دیئے۔

ہم بیان کر چکے کہ اغیار کے اثرات کو زائل کرنا۔ شیعیت کے صحیح اصول و فروع کی تعلیم دینا، تبلیغ کے اور ذرائع مہیا کرنا، تا حال اودھ کی ہر ہر فرد کو خیر و خیرات کی طرف مائل کرنا، صاحبان دولت و ثروت میں نشر تعلیمات ربّانی کے جذبات کو ابھارنا، مدرسے قائم کرنا، اوقاف کی طرف مائل کرنا اور سب سے زائد عزاداری کو، جو شیعیت کا اعلیٰ ترین مشن ہے، نقائص سے پاک کر کے مفید اور ضروری اصلاحات کے ساتھ عام کر دینا، سب کچھ اسی خاندان کا فیض عام تھا۔ انداز خیالات بدلنے کے ساتھ ہی جمہوریت کو حدود شریعت کے اندر برسر کار لانا بھی اس خاندان کا فیض ہے۔ ہر فرد شیعہ کو معلوم ہے کہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس جس کا پہلا نام انجمن صدر الصدور کانفرنس امامیہ اثناعشریہ تھا وہ پہلا واحد ادارہ تھا جس کی بنیاد ۱۹۰۷ء میں خاندان اجتہاد کے رکن رکین جناب قدوۃ العلماء مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ طاب ثراہ نے رکھی اور انتہائی محنت و جانفشانی سے اس کی آبیاری کر کے اس درجہ پر پہنچایا کہ آج بھی وہی صرف ایک جمہوری شیعہ ادارہ ہے جس کو آل انڈیا مرکز تسلیم کیا جانا ناگزیر ہے۔

آل پاکستان شیعہ کانفرنس بھی اسی کا ایک شعبہ تھا جو تقسیم ہند سے پہلے پراونشل اور اب آل پاکستان ہوگیا۔ اس شیعہ کانفرنس کی بیدار کن تحریکوں کا نتیجہ مدرسۃ الواعظین، شیعہ کالج، یتیم خانہ، شیعہ اخبارات، دارالمطالعہ، سرفراز پریس اور بے شمار مذہبی اور قومی شکلوں میں ظاہر ہوا۔ اس وقت بھی خدا کے فضل سے خاندان اجتہاد میں بہ کثرت علماء و مجتہدین و واعظین موجود ہیں جن کی آبیاری سے بہار شیعیت قائم ہے۔ جناب قدوۃ العلماء ہی کی یہ ذات تھی کہ آپ نے شیعوں کے افلاس اور بے کاری پر نظر کرتے ہوئے خاندان اجتہاد ہی کے بعض افراد کو کسب معاش کے معمولی معمولی ذرائع جیسے آٹے دال وغیرہ اور کپڑے کی معمولی معمولی تجارتوں کی طرف مائل کیا اور بعض اوقات

دوکانوں پر بیٹھ کر خود سودا بیچا۔ ابھی ۷۵ء کا ذکر ہے کہ خاندان اجتہاد کے ہی طبقہ علماء نے بازاروں میں پھیری لگا کر سودا بیچنے کے عیب کو مٹانے کے واسطے ٹھیلہ پر معمولی سامان رکھ کر لکھنؤ کے مختلف محلوں میں گردش کی تاکہ شیعوں کے دل سے اس انداز کی حقارت ختم ہوجائے۔ یوں تو مواعظ اور بیان فضائل ومصائب سیدالشہداء میں بہت سے واعظین وذاکرین انتہائی بلند درجوں پر فائز تھے اور فائز ہیں۔ مگر دور حاضر میں جناب سید العلماء مولانا علی نقی نقوی صاحب قبلہ اور جناب عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ مدظلہما نے جو اصلاحی انداز میں موعظہ اختیار کیا ہے وہ تمام عالم اسلامی میں خاص طور سے جاذب نظر ہوگیا ہے۔ ان حضرات کے مواعظ میں ضروریات زمانہ کی مطابقت سے ہر موضوع مواعظ کی صورت میں پیش نظر ہوجاتا ہے۔ جمہوریت وشخصیت، معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، سائنس، ضرورت مذہب، حقوق نساء، غیر مسلم کے اعتراضات کا جواب، بہرحال کوئی موضوع ایسا نہ ملے گا جس پر جناب عمدۃ العلماء اور سیدالعلماء نے اپنے سلسلۂ بیان میں روشنی نہ ڈالی ہو۔ یہ ہیں خاندان اجتہاد کے خدمات جو عروج شیعیت کے واحد ذمہ دار ہیں اور جن کی کوششوں سے شیعیت نے وہ بلندی حاصل کی جو آج کسی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جناب غفران مآبؒ کی وہ دعا جس کا ذکر ہم صفحات گذشتہ میں کرچکے ہیں یقیناً قبول ہوچکی ہے لہٰذا آئندہ بھی اس خاندان کا علمی سلسلہ قائم رہے گا۔ اور شیعیت کی تبلیغ وحمایت اسی سلسلۂ علم واجتہاد کی کوششوں سے قائم رہے گی۔

## شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد

عام طور سے مشہور ہے کہ شیعہ سنی اختلاف مسئلہ خلافت میں ہے لیکن یہ صحیح نہیں اصل اختلاف عقل ونقل کا ہے۔ حضرات اہلسنت کے نزدیک معتقدات میں عقل سے کام لینا شبہات وساوس پیدا کرکے ایمان کو متزلزل کردینا ہے لہٰذا جو بات نقل در نقل جس طرح پہنچی اس پر ایمان لانا چاہئے۔ مثلاً یہ سنا کہ قرآن خدا کا کلام ہے لہٰذا ماننا چاہئے کہ وہ کلام کرتا ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے کلام کیونکر صادر ہوسکتا ہے۔

## جبر واختیار

اسی طرح دیکھا جائے کہ دنیا میں خیر وشر دونوں ہیں اور قرآن میں ہے کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے تو مان لیا کہ خدا خیر وشر دونوں کا فاعل ہے اور چونکہ ہر چیز کا خالق ہے، اس لئے بندوں کے اعمال کا بھی وہ خالق ہے اب انسان کا کوئی فعل ذاتی نہیں رہا، وہ مجبور ہوگیا اب اس کے کئے پر سزا خلاف عدل ہے لہٰذا کہہ دیا جائے کہ خدا کے لئے عدل ضروری نہیں، ایک گروہ نے اس کو کفر بتایا اور کہا کہ انسان اپنے فعل کا مختار ہے۔ اس طرح حضرات اہلسنت میں دو فرقے ہوگئے اشعری ومعتزلی۔ جس طرح فقہ کے چار امام ہیں، اسی طرح عقائد میں دو امام ہیں اور تمام اہلسنت ان ہی دو میں سے کسی ایک کے پیرو ہیں۔ ایک ابوالحسن اشعری دوسرے ابوالمنصور ماتریدی یعنی حضرات اہلسنت میں دو طرح کے لوگ ملیں گے۔ ایک کا یہ عقیدہ ہوگا کہ بے حکم خدا پتہ نہیں ہلتا جسے مقدر کہا جاتا ہے اس کی تہہ میں یہ بات ہے کہ جو کچھ ہوا تقدیر الٰہی کی بنا پر ہوا۔ خلفاء پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ مولانا شبلی نے بھی یہی لکھا ہے کہ خلفاء کو الزام سے بری کرنے کے لئے یہ عقیدہ گڑھا گیا ؎

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

میں یہ راز آشکار نظر آتا ہے۔ انھوں نے خلفاء کے ظلم وجور کے واقعات لکھ کے یہ لکھا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ یہ خلیفہ نے کیا، ایسا نہیں خدا نے مقدر ہی کیا تھا۔

دوسرا گروہ تدبیر کا قائل ہے جس نے جو کچھ حاصل کیا وہ اس کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھا۔

## رویت باری

اسی طرح انھوں نے بعض آیات دیکھے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کا دیدار ہوگا تو دیدار کے قائل ہوگئے، اس سے

بحث نہیں کہ اس کا دیدار عقلاً ممکن بھی ہے یا نہیں۔

**عصمت انبیاء میں اختلاف**

قرآن وحدیث میں معصیت کی قسم کے الفاظ دیکھ کر انبیاء کو غیر معصوم مانا اور آدم سے خاتم تک انبیاء اولوالعزم کے گناہ میں مبتلا ہونے کا ثبوت قرآن وحدیث سے پیش کیا۔

پیغمبر ختمی مرتبت نے فرمایا کہ میں تمہاری طرح کا انسان ہوں۔ لہٰذا وہ تمام خصوصیات بشری خطا ونسیان، گناہ اور رائے کی غلطی کے امکان کے قائل ہو گئے اور بہت سے موقعوں پر ان کی رائے کی غلطی قرآن وحدیث سے پیش کی۔ دوسری طرف نزول وحی کا ذکر سنا تو یہ عقیدہ اختیار کیا کہ نبی کی دو حیثیتیں ہیں: ایک بشری، دوسری الہامی۔ ان کے کچھ اقوال واعمال ذاتی حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ الہامی۔

**خلافت میں اختلاف کی بنیاد**

مسئلہ خلافت میں انھوں نے دیکھا کہ چند آدمیوں نے فلتۃً (بے سمجھے بوجھے اچانک) حضرت ابوبکر کو خلیفہ بنایا۔ اس سے یہ اصول بنا کہ اجماع سے خلیفہ ہوتا ہے، خواہ چند افراد ہی کا اجماع ہو۔ دوسری خلافت استخلاف سے ہوئی۔ اس سے استخلاف کا طریقہ ثابت ہوا۔ حضرت عمر نے اپنے بعد کے لئے خلیفہ کا انتخاب ایک کمیٹی کے سپرد کیا۔ اس سے شوریٰ کا اصول بنا۔ امیر معاویہ نے بزور خلافت پر قبضہ کیا، اس سے قہر وغلبہ سے خلافت حاصل کرنے کا اصول قائم ہوا۔ بعد کے خلفاء نے فسق وفجور کیا، اس سے معلوم ہوا کہ خلیفہ کے لئے نیک چلنی ضروری نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ واقعات اور حالات کی رفتار پر اسلامی معتقدات کی عمارت بنتی رہی اور ان معتقدات کی صحت وعدم صحت پر گفتگو اصولاً غلط قرار پائی۔ علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفی میں لکھا ہے کہ اجماع سقیفہ کو باطل نہ کہو کیونکہ اس سے صحابہ پر الزام آئے گا۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ چونکہ بعد کے خلفاء سے فسق وفجور ظاہر ہوا، اس سے خلیفہ کے واسطے فسق وفجور بطلان خلافت کا سبب نہیں بن سکتا۔ یہ اسی اصول پر ہے کہ جو بات ہوگئی اور اسے لوگ نسلاً بعد نسلٍ مانتے چلے آئے، وہی صحیح ہے اور اسی پر ایمان لانا چاہئے اس میں عقل آرائی درست نہیں۔

شیعوں کے چیلنج پر ان معتقدات کی صحت پر قرآن وحدیث رجال ودرایت کی رو سے زور دیا جانے لگا۔ اجماع، استخلاف اور شوریٰ کا حکم زبردستی قرآن وحدیث سے پیش کیا گیا۔ خلافت کا منہاج نبوت سے ہٹ کر ملوکیت میں بدل جانا یوں صحیح ہے کہ خود رسولؐ خدا نے فرمایا تھا کہ میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی اس کے بعد ملوکیت ہوجائے گی لہٰذا یہ ملوکیت منشائے خدا اور رسولؐ کے موافق اور امیر معاویہ کی خلافت صحیح وجائز ہوئی اس لئے بعد کے خلفاء بھی اپنے تمام تزک واحتشام اور اعمال کے ساتھ جانشین رسول قرار پائے اور ان کی اطاعت مذہبی حیثیت سے ہر مسلمان پر واجب رہی۔ فلسفی اور مفکر اقبالؔ بغداد شریف کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

سرزمیں تیری نہ ہو کس طرح ہمدوش ارم
جس نے چومے جانشینانِ پیمبر کے قدم

باوجودیکہ ان کے زمانہ میں ان کے بڑے عالم وفاضل اور متقی وپرہیزگار لوگ موجود تھے مثلاً امام ابوحنیفہ، امام مالک، قاضی ابو یوسف وغیرہ۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ جو واقعہ جس طرح ہوگیا اسے سنی مسلمان صحیح تسلیم کرتے چلے آئے اور اس میں عقل کے دخل کو غلط اور ایمان کے تزلزل کا باعث سمجھتے رہے۔

شیعہ اپنے عقائد کی بنیاد عقل پر قرار دیتے ہیں، اس لئے وہ عقلی مسلمان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل خود رسول باطن ہے۔ ہر چیز کی بھلائی برائی خود سمجھ سکتی ہے۔ اس میں سننے کو دخل نہیں۔ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں، عقل سے پہچانا ہے۔ رسولؐ نے خدا کے وجود کی خبر دیکھ کے نہیں دی۔ فرشتہ کو فرشتہ اور وحی کو وحی سمجھا عقل سے۔ اور خدا نے یہی چیز انسان کو بھی دی ہے جس نے اسے انسان بنا دیا۔ اور اس سے کام نہ لینا کتنا غلط ہے۔ اگر انسان غور کرے تو خود بخود ہر چیز اپنے وجود کو سمجھا دے گی۔ حالانکہ بہت سی چیزوں کو اس نے نہ دیکھا اور نہ سنا ہوگا۔ کسی

جنگل میں ایک گھڑی ملے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ کسی مسافر کے ہاتھ سے گر گئی۔ حالانکہ اس نے یہ نہ دیکھا اور نہ کسی سے سنا۔اسی طرح کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز ایک خاص نظام اور ترتیب کے ساتھ مصروف عمل ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے کوئی چیز اپنے عمل کو چھوڑ دے تو نظام کائنات برہم ہوجائے۔اس سے انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے جو ہر وقت دیکھتا اور خبر رکھتا ہے اور کسی کو عمل سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ یہیں سے اس کے صفات معین ہوتے ہیں کہ وہ: (۱) عالم ہے (۲) قادر ہے (۳) مرید ہے (۴) حیّ ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اب عقل نے خود سوال کیا کہ وہ کیا ہے۔ اگر جسم رکھتا ہے تو کوئی جسم بغیر جگہ کے ٹک نہیں سکتا۔ اس سے پہلے جگہ ہونا چاہئے۔ اگر اس سے پہلے جگہ تھی تو اس کو کس نے پیدا کیا وہی اس کا بھی خالق قرار پائے گا۔لہٰذا عقل یہ ماننے پر مجبور ہوئی کہ جسم نہیں رکھتا۔ پھر عقل نے سوچا کہ جب وہ جسم نہیں تو دیکھنے میں کیونکر آسکتا ہے اس لئے یہ طے کیا کہ وہ مرئی نہیں ہے۔ اس طرح صفات سلبیہ قائم ہوئے۔عقل یہ سب منزلیں خود طے کرتی چلی گئی اور اس نے تسلیم کرلیا کہ ان اوصاف کے خالق نے دنیا کو پیدا کیا۔

مخلوقات کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انسان میں ذہنی اور دماغی اور لسانی صلاحیتیں ایسی ہیں جو کسی اور مخلوق میں نہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کی اس میں صلاحیت ودیعت کی گئی ہے تو ضروری ہوا کہ اس اجتماعی زندگی کے لئے کوئی قانون ہو اور اس قانون کو بتانے اور عمل کرکے دکھانے کے لئے ایک آدمی ہو جو عمل کرکے دکھائے۔ اس کے لئے انبیاء ورسل کی ضرورت ہوئی جو ایک طرف تو انسان تھے مگر اتنے کامل کہ بھول چوک گناہ اور رائے کی غلطی سے بری۔ اگر ان میں بھول چوک ہے تو خدا کے حکم کو بھول سکتے ہیں۔ گناہگار ہیں تو عمل کا نمونہ اور اعتماد کا محل نہیں بن سکتے۔ اگر غلطی کرتے ہیں اور دوسروں کی رائے کے محتاج ہیں تو رائے دہندہ ان سے بہتر ہے، تو نبی کی امت پر فضیلت کیا ہوئی اور ایسی غلط رائے قائم کرنے والا منشائے خداوندی سمجھنے میں بھی غلطی کرسکتا ہے۔شیطان کو فرشتہ اور وساوس کو وحی قرار دے سکتا ہے۔

اگر کچھ ذاتی اور کچھ الہامی حیثیت سے کہتا ہے تو پوری شریعت مشکوک ہوجاتی ہے۔ اس لئے عقلاً ضروری ہے کہ وہ ایسی تمام کمزوریوں سے بری یعنی معصوم ہو۔ اور جن آیات واحادیث سے ان کے گناہ کا صدور سمجھ میں آتا ہے ان کا مطلب یقینا کچھ اور ہونا چاہئے اور ائمہ اہلبیتؑ نے کچھ اور بتایا بھی ہے وہی ائمہ اہلبیتؑ جن کے متعلق مولانا شبلی نے فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں مگر امام جعفر صادقؑ سے ان کو کیا نسبت تمام اسلامی علوم اہلبیتؑ کے گھر سے نکلے اور وہ اَدْرِیٰ بِمَا فِی الْبَیْتِ ہیں۔ مگر نقلی طور پر مولانا شبلی، مقلد امام ابوحنیفہ صاحب ہی کے تھے۔ اور امام جعفر صادقؑ کے قول پر امام ابوحنیفہ کے قول کو ترجیح دیتے تھے۔نقل کی بنا پر۔

## مسئلہ خلافت شیعی نقطہ نظر سے

قرآن اسلامی قانون ہے جس میں تین سو مجمل احکام، کچھ قصص وعمرانیات اور کچھ متشابہات ہیں اور یہ سب وحی متلو ہے جو رسولؐ کی طرف نازل ہوئی۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ صلوٰۃ قائم کرو۔ صلوٰۃ کے کیا معنی ہیں۔ کیونکر قائم کی جائے یہ رسولؐ کو معلوم ہے۔

یاَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَااُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ۔

اے رسولؐ پہنچادو وہ چیز جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے۔ وہ کون بات ہے۔ بس رسولؐ کو معلوم ہے وحی غیر متلو کے ذریعہ سے جسے علم رسالت کہتے ہیں۔ یا خاصہ رسالت۔

اب قرآن کو رسولؐ سے الگ کرلیجئے تو اس کے معنی معلوم نہیں ہوسکتے اسی طرح قرآن سے الگ رسول کی کوئی حیثیت نہیں جسے مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُوْحٰی کہہ کے بتایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن رسولؐ کے ساتھ اور رسولؐ

قرآن کے ساتھ ہے اور اسلامی قانون کوئی مکتوبی نہیں۔ بلکہ عمل رسولؐ ہے۔

رسولؐ کے بعد رسولؐ کا جانشین وہی ہوسکتا ہے جسے اس تمام وحی غیر متلو کا بھی علم ہو جو رسولؐ کے سینہ میں محفوظ تھی۔ جب کہ اسلام کا قانون صرف مکتوبی نہیں۔ بلکہ عملی زندگی ہے تو رسولؐ کے بعد بھی ایسا شخص ہونا چاہئے جس کی زندگی قرآن کے ساتھ اور قرآن اس کے ساتھ ہو اور رسولؐ کا فریضہ ہے کہ وہ ایسے اشخاص کا نام بتا جائیں۔ رسولؐ نے اس فرض کو پوری طرح ادا کر دیا اور اپنے بعد کے لئے امت کے واسطے ایسے افراد بتا دیئے جن کا علم رسولؐ کا علم اور عمل رسولؐ کا عمل تھا۔

اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔ اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔ عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِيٍّ۔ اَقْضَاكُمْ عَلِيٌّ۔ اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ۔

عہد رسولؐ سے آج تک کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکا کہ علیؑ سے بڑھ کے کوئی عالم قرآن اور عامل قرآن ہے۔ اور چونکہ رسولؐ کے مشن کی بقا کا دارومدار اسی پر تھا، اس لئے وہ بھی زندگی بھر علیؑ کا تعارف امت سے کراتے رہے اور اپنی زندگی کے آخری سال حج سے واپسی پر مقام غدیر میں پہنچ کے منادی کرائی کہ جو لوگ آگے بڑھ گئے ہیں پلٹ آئیں اور جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ آگے بڑھ آئیں۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو پالان شتر کا ایک منبر بنوایا اور اس پر بلند ہو کے ایک فصیح وبلیغ خطبہ فرمایا جس میں اپنے ارتحال کی خبر دی۔ پھر پوچھا کہ کیا میں تمہارے نفسوں کا تم سے زیادہ حاکم نہیں ہوں؟ لوگوں نے کہا بیشک! تو فرمایا کہ جس کا میں حاکم ہوں اس کا یہ علیؑ بھی حاکم ہے۔ اے خدا جو علیؑ کو دوست رکھے اس کو تو دوست رکھ اور جو علیؑ کو دشمن رکھے اس کو تو دشمن رکھ۔ حضرت عمر نے سب سے پہلے مبارکباد دی اور کہا کہ اے علیؑ مبارک ہو کہ تم سب مومنین ومومنات کے حاکم قرار دیئے گئے۔ علمائے اہلسنت اس میں سے کسی بات کے منکر نہیں کیونکہ یہ واقعہ مستند طرق سے تمام معتبر کتابوں میں درج ہے۔ مگر وہ اسے جانشینی کا اعلان نہیں قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کو آنحضرت نے تبلیغ کے لئے یمن بھیجا تھا۔ وہاں سے واپسی پر خالد بن ولید وغیرہ نے اموال مسلمین میں علیؑ کی خیانت کی شکایت کی۔ اس پر رسولؐ نے یہ فرمایا جس کا میں دوست ہوں اس کا علیؑ بھی دوست ہے۔ افصح العرب نے کاش یہی فرمایا ہوتا کہ جو مجھے دوست رکھتا ہے وہ علی کو بھی دوست رکھے، یہ بے تکی بات شان رسالت کے قطعی منافی ہے۔ خود الفاظ بتاتے ہیں کہ ان کا محل استعمال کچھ اور ہے پہلے اپنی حاکمیت کا اقرار لینے کے بعد یہ کہا کہ جس کا میں مولا ہوں یعنی جس کا حاکم ہوں اس کا یہ علیؑ بھی حاکم ہے۔ لہٰذا یہ اعلان تھا اپنے بعد کے لئے خلافت کا اور سقیفہ میں خلافت کی تشکیل ناجائز ہوئی اور خلافت ایسے ہاتھوں میں پہنچ گئی جو علم وفضل، تقویٰ ودیانت، فہم وفراست اور اسلامی تدبر وسیاست میں علیؑ کے مقابلہ میں کوئی درجہ نہیں رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روح اسلامی کو زوال شروع ہوا۔ رسولؐ نے ایک معاشرہ کی تشکیل کی تھی جس کے تمام افراد میں برابری اور برادری تھی۔ کوئی طبقہ حاکم اور کوئی محکوم نہ تھا اور ایک کو دوسرے پر تسلط واقتدار قائم کرنے کی ضرورت نہ تھی تو فوج اور خزانہ کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ہر مسلمان سپاہی اور اس کی جیب خزانہ تھی اور پیغمبرؐ خدا نے بغیر فوج اور خزانہ کے ایک ملک کو ایسا بنا دیا کہ دشمنوں کے اسّی بیاسی حملے بیکار ہوگئے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ فوج اور خزانہ اہل ملک پر حکومت کرنے کے لئے ہوتا ہے اور جب کسی بڑے دشمن کا مقابلہ ہوتا ہے تو فوج اور خزانہ بیکار ثابت ہوتا ہے اور عام بھرتی اور تحصیل زر شروع ہوجاتی ہے۔ آج بھی یہی صورت موجود ہے۔ اسی کو دنیا سے مٹانے کے لئے رسولؐ نے ایک نئے معاشرے کی تشکیل کی تھی لیکن غلط ہاتھوں میں خلافت کے چلے جانے سے وہ معاشرہ ختم ہوگیا۔ اور اسلام میں قیصر وکسریٰ پھر پلٹ آئے۔ آج بھی اگر منہاج نبوت پر کوئی حکومت قائم کی جائے تو وہ دنیا کی سب سے مضبوط حکومت ہوگی۔ بغیر فوج اور خزانہ کی۔ بظاہر تو یہ ناممکن بات معلوم ہوتی ہے

لیکن ایسا نہیں۔

عہد رسالت میں ہر شخص بطور خود فن حرب میں مہارت حاصل کرتا تھا۔ اس لئے ہر شخص سپاہی تھا اور وقت پر ایک آواز میں ٹرینڈ سپاہی ایک منظم فوج بن جاتے تھے۔

رسولؐ نے لوگوں کو تعلیم پر مامور کیا اور وہ لوگوں کو پڑھاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم اسلامی معاشرہ کا جزو ہے۔ اس زمانے میں اگر فوجی تعلیم، مدارس کی تعلیم کا جزو بنا دی جائے، شہر کو حلقوں میں بانٹ دیا جائے اور ہر حلقہ میں ایک مدرسہ قائم ہو جو اس حلقہ کے تمام افراد کو اتنی سخت ٹریننگ دے جو فوجی مراکز میں ہوتی ہے تو ہمارے مدارس فوجی ٹریننگ کا سنٹر بھی بن جائیں اور ان کو یہ اہمیت حاصل ہو کہ مستقل فوجی مراکز کی ضرورت نہ رہے۔ اس طرح بجائے ایک محدود فوج کے پورا ملک ایک ایسی تربیت یافتہ فوج بن جائے جو دنیا کے کسی ملک کو حاصل نہ ہو اور فوج پر جو کروروں روپیہ صرف ہوتا ہے وہ بچت میں آجائے۔ اسی طرح عدلیہ کا انتظام ہو۔ ہر محلہ میں جو واقعہ ہوتا ہے اس کی اصلیت سے اہل محلہ واقف ہوتے ہیں۔ اور آج کل کی عدالتوں میں جب فیصلہ ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ فلاں مجرم چھوٹ گیا اور فلاں بے گناہ سزایاب ہو گیا۔ اگر متشرع اور متقی حاکم اور گواہوں کا معیار اسلامی ہو، سزائیں اسلامی ہوں تو جرائم کا فقدان ہو جائے اور معاشرہ خود ان فیصلوں پر مطمئن ہو۔ اہل محلہ خود مجرم کو حاضر کریں۔ ظالم کی حمایت کی کسی کو جرأت نہ ہو۔ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کا فرض ہے تو کسی اور قوت کو جرائم سے روکنے کے لئے معین کرنا بے معنی ہے۔ اس طرح پولیس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح اسلامی مالیہ ہے اور سب سے پہلے رسولؐ کر کے دکھا گئے جس کے لئے ہمیں کسی دستور سازی کی ضرورت نہیں۔

یہ ہے اسلامی نظام معاشرت و تمدن جسے حکومت کہنا اسلام کی روح کے منافی ہے۔ یہ اسلامی معاشرہ رسولؐ کے بعد باقی نہیں رہا اور اس میں ملوکیت داخل ہو گئی۔ اس لئے شیعہ اس خلافت کو مخرب اسلام کہتے ہیں جس نے اس اسلامی معاشرہ کو درہم و برہم کر دیا۔ جن لوگوں کو اس خیال میں حقیقت اور معقولیت نظر آتی ہے، وہ ہم خیال ہو جاتے ہیں۔

غفران مآبؒ سے پہلے اس حقیقت کو بتانے اور سمجھانے کی کسی میں جرأت نہ تھی انھوں نے جو تحریک شروع کی اس کے تین جزو تھے۔

**غفران مآب کی تحریک**

(۱) اپنے عقائد کو سمجھو (۲) اپنے مذہبی اعمال بجا لاؤ (۳) اپنی مذہبی حیثیت کے اظہار میں تامل نہ کرو۔

یہ ایک ایسی تحریک ہے جسے ہر وقت زندہ رکھنے کی ضرورت ہے اور اسی تحریک نے ہندوستان میں شیعوں کے وجود کو ظاہر کیا۔ آج بھی ضرورت اس کی ہے کہ ہم تیرہ رجب کو شیعہ نیشن ڈے منائیں اور اس تحریک کو زندہ کریں۔ غفران مآبؒ کی تحریک میں دوسرے مذاہب سے تخاطب نہیں تھا۔ آج بھی اسی طرح اس تحریک کو چلانے کی ضرورت ہے اسی لئے اس موقع پر یہ کتاب شائع اور یہ اپیل کی جاتی ہے کہ قوم اس کی طرف متوجہ ہو۔

